جلد ۷۴
عدد ۵

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

جنوری ۱۹۷۱ء

بہ مصطفےٰ برساں خویش کہ دیں ہمہ اوست

سیرتِ پاک پر تین بہترین کتب !

محسنِ انسانیت

نعیم صدیقی کے قلم سے

سیرت کا انقلابی پہلو، اچھوتا انداز

— مستند تاریخ —

اعلیٰ ایڈیشن : ۱۸/۵۰ روپے

سستا ایڈیشن : ۱۳/۵۰ روپے

محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم

عنایت اللہ سبحانی

دلچسپ انداز، نیا طرز، منفرد پیرایہ

اعلیٰ ایڈیشن : ۷/۰ روپے

سستا ایڈیشن : ۴/۷۵ "

حیاتِ طیبہ

محمد عبدالحی

آسان زبان میں — تحریکی انداز میں

اعلیٰ ایڈیشن : ۵/۰ روپے

سستا ایڈیشن : ۲/۷۵ روپے

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ

۱۳۔ ای شاہ عالم مارکٹ ۔ لاہور

۱۶۔ بیت المکرم — ڈھاکہ

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۷۵	جنوری ۱۹۷۱ء مطابق ذیقعدہ ۱۳۹۰ھ	عدد ۵

مغربی پاکستان — مشرقی پاکستان

چندہ سالانہ : آٹھ روپے — ماہنامہ ترجمان القرآن — (ہوائی ڈاک)، فی پرچہ ۹۰ پیسے سالانہ ۱۰ روپے

فی پرچہ : ۸۰ پیسے — ۵۔ اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور — (عام ڈاک)، ۸۰ پیسے ۔ ۸ روپے

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن، اچھرہ ۔ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

وَقَعَتِ الْوَاقِعَۃُ - جو ہونا تھا سو ہو چکا۔ عوام کی عدالت نے مشرقی پاکستان کے لیے عوامی لیگ اور مغربی پاکستان کے دو بڑے صوبوں کے لیے (جو عملاً پورے مغربی پاکستان پر حاوی ہیں) پاکستان پیپلز پارٹی کے حق میں اپنے اعتماد کا فیصلہ دے دیا ہے، یا زیادہ صحیح الفاظ میں جناب مجیب الرحمٰن اور جناب ذوالفقار علی بھٹو کے سر پر اقتدار کا تاج رکھ دیا ہے۔ عوام کی عدالت نے یہ فیصلہ اگرچہ جذبات کی رَو میں بہہ کر اور خوش آئند نعروں کے فریب میں آکر کیا ہے، مگر ہم جمہوریت کے حامی ہونے کی حیثیت سے اس فیصلے کو قبول کرتے ہیں اور خدا سے دُعا کرتے ہیں کہ وہ ان جماعتوں اور ان رہنماؤں کو ملک و ملت کی صحیح خدمت کرنے کی توفیق دے اور اہلِ پاکستان کی قوتیں اور صلاحیتیں صرف اکھاڑ پچھاڑ ہی میں ضائع نہ ہوتی رہیں۔

اس ملک میں جمہوریت کی راہ ہموار کرنے میں جو کردار جنرل محمد یحییٰ خان نے ادا کیا ہے وہ قابلِ قدر ہے اور ہم اُن سے بجا طور پر اس بات کی توقع رکھتے ہیں کہ تدوینِ دستور کے معاملے میں بھی وہ اُن وعدوں کو پورا کریں گے جو انہوں نے آئین کے اسلامی مزاج، نظریۂ پاکستان کے تحفّظ اور ملکی سالمیت کے بارے میں قوم سے کیے ہیں۔

جہاں تک ان انتخابات میں جماعتِ اسلامی کی "ناکامی" کا تعلق ہے ہمیں اس پر افسوس ضرور ہے کیونکہ ہم ایمانداری سے یہ سمجھتے ہیں کہ قوم نے بہت بڑا دھوکا کھایا ہے، مگر اس سے دل گرفتہ نہیں، کیونکہ خدا کے حضور میں ہم اپنے آپ کو بری الذمہ سمجھتے ہیں۔ ہم نے اپنی قوم کو کوئی دھوکا اور فریب نہیں دیا، ناجائز

ہتھکنڈوں سے اس کے سر پر سوار ہونے کی کوئی کوشش نہیں کی اور اس کو حق و صداقت کی راہ دکھانے کے لیے اپنے وسائل کی حد تک جو کچھ ہم کر سکتے تھے وہ کیا۔ مگر ایک طوفان اُسے بہا کر غلط سمت میں لے گیا۔ قوم کے اس غلط اقدام کے کیا نتائج ہوں گے، اُن کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔ مگر ہم پوری شدّت سے اس بات کو محسوس کرتے ہیں کہ یہ جو کچھ ہُوا ہے آناً فاناً نہیں ہُوا، بلکہ تقسیم ملک کے وقت ہی سے حالات جو رُخ اختیار کر رہے تھے یہ سب اُس کے منطقی نتائج ہیں اور اب بھی اگر سنبھلنے کی کوشش نہ کی گئی تو صورتِ حال مزید بگڑے گی۔ مالک الملک سے دُعا ہے کہ وہ ہمیں حق و صداقت کے راستہ پر گامزن رکھے اور اس طوفان کے نتائجِ بد سے بچائے۔

ان صفحات میں ہم پہلے اُن اسباب و وجوہ سے بحث کرنا چاہتے ہیں جن سے یہ طوفان برپا ہُوا اور اس کے بعد موجودہ صورتِ حال کا تجزیہ کر کے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ حالات کو کس طرح صحیح رُخ پر موڑا جا سکتا ہے۔ کسی قوم کی اس سے زیادہ بدقسمتی اور کیا ہو سکتی ہے کہ اُسے ۲۲ سال تک حقِ رائے دہی سے محروم رکھا جائے۔ ہمارا ہمسایہ ملک بھارت جو ہمارے ساتھ ہی آزاد ہُوا تھا، اب پانچویں انتخابات کی تیاریاں کر رہا ہے مگر ہمارے ہاں اب پہلی مرتبہ انتخابات ہوتے ہیں۔ پھر گذشتہ تیئیس سالوں میں بھی نہ صرف یہ کہ انتخابات نہیں ہوئے بلکہ ہر وہ حربہ اختیار کیا گیا جس سے قوم کا پاکستان کی نظریاتی اساس یعنی اسلام سے تعلق منقطع ہو اور جس سے جمہوریت کی رُوح کو فنا کرنے میں مدد ملے۔ پہلے نو سال تو دستور کی تدوین کے بارے میں کشمکش رہی جو کام زیادہ سے زیادہ ایک ڈیڑھ سال کے عرصہ میں مکمل ہو جانا چاہیے تھا اس میں ایک طویل مدت ضائع ہو گئی۔ اوّل روز ہی سے اس ملک کا بااثر اسلام بیزار طبقہ اس بات کے لیے مسلسل کوشاں رہا کہ دستور لادینی بنیادوں پر بنایا جائے۔ مگر عوام کی عظیم اکثریت اسے قبول کرنے پر آمادہ نہ تھی۔ عوام کے منشا اور مرضی کے علی الرغم غیر اسلامی نظامِ زندگی مسلط کرنے کا صرف ایک ہی راستہ تھا کہ جمہوریت نہ آنے پائے، آمریت کو اس ملک میں پنجے گاڑنے کے مواقع فراہم ہو جائیں اور اس کی قوت سے لادینی نظریات کو فروغ حاصل ہو اور عوام اس پورے المیہ کو بے بسی اور مجبوری کے عالم میں دیکھتے رہیں۔

اِس ناپاک مقصد کے حصول کے لیے پوری کوشش کی گئی کہ عوام جس اسلام کے معاملے میں تقسیم ملک کے وقت بالکل یکسو تھے اور جس کی عمل داری ہی کے لیے انہوں نے پاکستان حاصل کیا تھا، اُسی اسلام کے بارے میں اُن کے ذہنوں کے اندر مختلف شکوک و شبہات پیدا کیے جائیں۔ اِس "کارِ خیر" کے لیے مختلف سرکاری اور غیر سرکاری ادارے قائم کیے گئے اور ہر اُس شخص یا جماعت کی حکومت نے سرپرستی کی جو اسلام کو ایک ناقابلِ عمل اور فرسودہ نظامِ زندگی ثابت کرنے میں مصروف تھا، یا اسلام کے متفق علیہ امور کو بھی اختلافی بنانے پر تُلا ہوا تھا۔

اس کے علاوہ ایک منظم اسکیم کے تحت لوگوں کے اخلاق، خصوصاً نوجوان نسل کے اخلاق کو بگاڑنے کے لیے مختلف تدابیر عمل میں لائی گئیں۔ ثقافت اور آرٹ کے نام پر اُن کے اندر بے حیائی پھیلائی گئی۔ فکری آزادی اور روشن خیالی کے نام پر انہیں برائیوں کا خوگر بنایا گیا۔ غیر سنجیدہ طرزِ عمل اور ہنگامہ آرائی کی انہیں باقاعدہ تربیت دی گئی۔ ان ساری کارروائیوں کا مقصد ایک ہی تھا کہ کسی طرح نوجوان نسل کو اخلاقی اعتبار سے اس قدر بگاڑ دیا جائے کہ وہ ذہنی اور عملی طور پر اسلامی نظام کے قابل نہ رہے اور اگر وہ عوامی دباؤ کے تحت کبھی اس کی گرفت میں آبھی جائے تو وہ اس سے بغاوت کرنے پر آمادہ ہو جائے۔

یہ تھیں وہ ساری کارروائیاں جو نظریاتی اور سیاسی میدان میں اسلام کی راہ روکنے کے لیے کی گئیں۔ معاشی اور انتظامی دائروں میں بھی ہر وہ کام کیا گیا جس سے عوام کے اندر بے چینی اور طبقاتی کش مکش پیدا ہو۔ ظالمانہ جاگیرداری نظام جس کے چنگل میں یہاں کے کسان پہلے سے گرفتار تھے، اُسے ختم کرنے اور عوام کو جاگیرداروں کے جبر و استبداد سے بچانے کے بجائے اُسے نہ صرف مزید فروغ دیا گیا بلکہ اور زیادہ مستبد اور جابرانہ بنا دیا گیا۔ سرکاری اراضی مزارعین میں تقسیم کرنے کے بجائے سیاسی رشوت کے طور پر بڑے بڑے حکام اور زمینداروں میں اندھا دھند بانٹ دی گئیں۔ صنعت و حرفت اور تجارت میں سرمایہ داری کو غیر معمولی تقویت پہنچائی گئی۔ سرمایہ کاری کے دائروں کو صرف چند خاندانوں کے لیے وقف کر دیا گیا اور انہیں ناجائز استحصال کے پورے پورے مواقع فراہم کیے گئے۔ غیر ملکی قرضوں کے سارے فائدے بڑے سرمایہ داروں نے حاصل

گیے اور اُن کا بوجھ غریب عوام پر لاد دیا گیا۔ ضروریاتِ زندگی کی ہوش رُبا گرانی سے عوام کی کمر ٹوٹ گئی مگر ان زرداروں کو اپنی لُوٹ کھسوٹ کی فکر رہی۔ ان کے اندر کبھی یہ احساس پیدا نہ ہُوا کہ دولت کے ان انباروں سے غریب محنت کشوں کو بھی کوئی حصّہ ملنا چاہیے۔ حکومت کی تجارتی پالیسی نے مسابقت کی ساری راہیں مسدود کردیں اور صنعت و تجارت کے سارے منافع ایک محدود طبقے کے ہاتھ میں سمٹ کر رہ گئے۔

ایک طرف جاگیرداروں اور سرمایہ داروں نے عام انسانی زندگی کو بالکل عذاب بنا رکھا تھا تو دوسری طرف نوکر شاہی طبقے نے عوام کے ساتھ ایک ایسی غلط اور ظالمانہ روش اختیار کر رکھی تھی جو ہر لحاظ سے اس انداز کی تھی کہ گویا یہ کسی دوسری قوم کے لوگ ہیں جو اپنے ملک پر نہیں بلکہ کسی غیر ملک پر حکومت کر رہے ہیں۔ یہ غیر ملکی سامراج کے پروردہ لوگ تھے، اور غیر ملکی سامراج اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل کے لیے نوکر شاہی کو جس انداز کی تربیت دیتا ہے۔ اور پھر اُسے جس طرح استعمال کرتا ہے، اس سے کون ناواقف ہے؛ نخوت و تکبّر، عوامی احساسات سے بے حسی اور بے پروائی، زیر دست آزاری؛ یہ وہ عام خصائص ہیں جو غیر ملکی سامراج اپنے محکوم ملک میں انتظامیہ کے کارکنوں کے اندر پیدا کرتا ہے۔ اُس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ عوام انتظامیہ کو جبر اور قہر کی طاقت سمجھ کر اس کے سامنے دم بخود رہیں اور سامراج جونک کی طرح اُن کا خون چوستا رہے۔ آزادی کے بعد اس بات کی اشد ضرورت تھی کہ انتظامیہ کے اس غلط مزاج کو بدلا جائے اور یہ انتظامیہ وہ روش اختیار کرے جو ایک قوم کے حکام کو خود اپنی قوم کے اندر حکومت کرنے کے لیے اختیار کرنی چاہیے۔ مگر اس افسوسناک حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نہ صرف انتظامیہ کا مزاج وہی رہا جو انگریزی دور میں تھا بلکہ اس میں مزید خرابیاں پیدا ہوئیں۔ اس کی متعدد وجوہ تھیں۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار کی باگیں آئیں وہ اپنے سامنے کوئی نظریاتی پروگرام نہ رکھتے تھے، بلکہ زیادہ سے زیادہ مدت تک سیاسی اقتدار بہر طور اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے عوامی تائید کے بل پر حکومت کرنے کے بجائے نوکر شاہی کے بل پر حکومت کرنے کی کوشش کی اور ہر قدم پر اقتدار کی رسہ کشی میں اس سے مدد لی۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ انتظامیہ روز بروز زور پکڑتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ اصل اقتدار عوام کے نمائندوں کے بجائے اس کے

ہاتھ میں چلا گیا۔ دوسرے انتظامیہ کے فکر و نظر میں تبدیلی کے لیے تربیت کا کوئی انتظام نہ کیا گیا۔ جن بُری صفات سے انگریزی حکومت انتظامیہ کو متصف دیکھنا چاہتی تھی انہی صفات، بلکہ اس سے بدتر صفات کی پرورش کا آزادی کے بعد بھی برابر انتظام کیا جاتا رہا۔ عوام اس صورتِ حال سے سخت رنجیدہ ہوتے اور وُہ یہ محسوس کرنے لگے کہ آزادی کے بعد بھی وہ نوکر شاہی کے غلام ہیں۔

جاگیرداری، سرمایہ داری اور نوکر شاہی کی ملی بھگت نے حالات کو عوام کے لیے بالکل ناقابلِ برداشت بنا دیا تھا۔ مگر وہ اِس آس پر جیتے رہے کہ شاید دستور کی تدوین کے بعد اُن کی محرومیوں کی شبِ تاریک کا خاتمہ ہو اور پاکستان کی سرزمین کو اسلام کی ضیا پاشیاں منور کر دیں۔ نو سال کی مسلسل کش مکش کے بعد ۱۹۵۶ء کا دستور بنا۔ اگرچہ اس دستور کو صحیح معنوں میں اسلامی دستور نہیں کہا جا سکتا تھا، تاہم اس میں اس بات کی گنجائش تھی کہ اگر انتخابات کے ذریعہ عوام کے صحیح نمائندے آکر اس کو چلانے کی کوشش کرتے تو ملک کو اسلامی ریاست بنایا جا سکتا تھا اور دستور کے نقائص بھی دُور کیے جا سکتے تھے۔ مگر اس دستور کے پاس ہونے کے ساتھ ہی بے دین عناصر نے اس کے خلاف جدوجہد شروع کر دی۔ ان میں سے ایک فریق نے بڑی عیاری کے ساتھ اسلام کا راستہ روکنے کے لیے اِس دستور میں مخلوط انتخاب کا اڑنگا لگا دیا جس سے مشرقی پاکستان کی سیاست کا مزاج یکسر تبدیل ہو گیا۔ مشرقی پاکستان کی حد تک مخلوط انتخاب کا مطلب یہ تھا کہ وہاں جو شخص یا پارٹی اسلام کا نام لے وہ ہندوؤں کی تائید سے محروم ہو جاتے، اور جو شخص یا پارٹی کوئی لادینی پروگرام لے کر آئے وہ ہندوؤں کے پُورے ووٹ لے کر مسلمانوں کی صرف تھوڑی سی تعداد کی تائید حاصل کر کے کامیاب ہو جاتے۔ چنانچہ وہاں اُن پارٹیوں اور لیڈروں نے سر اٹھایا جنہیں ہندوؤں کی تائید حاصل تھی۔ اس سے ملحد اور دین سے بیزار عناصر کو شہ ملی اور انہوں نے اس نئی صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سیاسی میدان میں قسمت آزمائی شروع کر دی۔ اُنہیں جب اس امر کا یقین ہو گیا کہ اب اگر انتخابات ہوں تو تختِ اقتدار پر صرف اُن کا ہی قبضہ ہو گا تو پھر انتخابات کے لیے آمادگی کا اظہار کیا گیا۔ پھر انتخابات کے اعلان کے بعد مشرقی اور مغربی پاکستان میں تمام وہ ہتھکنڈے استعمال کیے گئے جن سے ووٹروں کو مرعوب کیا جا سکتا تھا۔ دھونس دھمکی

لالچ، جھوٹے وعدے، غنڈہ گردی کے مظاہرے، یہ وہ عام حربے تھے جن کو کام میں لا کر فضا کو اپنے حق میں ہموار کیا جانے لگا۔ اپنے ڈھب کے افسروں کو اپنے اپنے حلقوں میں تعینات کروانے کے لیے وسیع پیمانے پر تگ و دو کی گئی تاکہ انتظامیہ سے بھی انتخاب جیتنے میں پوری طرح کام لیا جائے جس طرح ۱۹۵۱ء کے صوبائی انتخابات میں لیا گیا تھا۔ بہ صورتِ حال کسی اعتبار سے بھی جمہوریت کی راہ ہموار کرنے کے لیے موزوں نہ تھی اور حالات کے تیور صاف بتا رہے تھے کہ جمہوریت کی صبح طلوع ہونے کے بجائے آمریت اپنے تاریک سایے پھیلانے کے لیے منتظر ہے۔ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی نے سات اور آٹھ اکتوبر ۵۸ء کی درمیانی شب کو موچی دروازہ لاہور میں تقریر کرتے ہوئے ان خطرات کی بڑے واضح الفاظ میں نشاندہی کی اور قوم کو متنبہ کیا کہ زبردستی انتخابات جیتنے کے لیے جو حربے استعمال کیے جا رہے ہیں ان کا نتیجہ یہ ہرگز نہیں ہوگا کہ کوئی سیاسی پارٹی جیت کر برسرِ اقتدار آ جائے، بلکہ ان سے جمہوریت کی موت واقع ہو جائیگی اور بعید نہیں کہ کوئی اچانک انقلاب ہمارے سروں پر کسی ڈکٹیٹر کو مسلط کر دے۔ عجیب اتفاق ہے کہ مولانا کی تقریر رات ساڑھے دس بجے ختم ہوئی اور اسی رات بارہ بجے دستور منسوخ کر دیا گیا، پارلیمنٹ توڑ دی گئی، وزارتیں رخصت کر دی گئیں اور ملک میں مارشل لا کے نفاذ کا اعلان کر دیا گیا۔ اس طرح ملک جمہوریت کی عین دہلیز پر پہنچ کر آمریت کے چنگل میں دس سال تک کے لیے گرفتار ہو گیا۔

ان دس سالوں میں ملک کو برباد کرنے اور قوم کو ذہنی، اخلاقی، جمہوری اور اقتصادی طور پر تباہ کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی گئی۔ ایوب صاحب نے سب سے پہلا کام تو یہ کیا کہ ملک میں ہر اُس شخصیت کو ذلیل اور ہر اُس جماعت کو بدنام کرنے کی کوشش کی جس کے متعلق انہیں اس بات کا معمولی سا گمان بھی تھا کہ وہ عوام میں مقبول ہو کر اُن کی قیادت کے لیے کسی وقت بھی خطرہ کا باعث بن سکتی ہے۔ اس معاملے میں سب سے زیادہ "نوازش" جماعت اسلامی اور اس کے امیر مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی پر کی گئی۔ اُن کے خلاف جھوٹے پراپیگنڈے، دشنام طرازی اور افترا پردازی کی باقاعدہ مہم چلائی گئی۔ اس پر بے تحاشا روپیہ خرچ کیا گیا۔ بکثرت کتابیں ان کے خلاف لکھوائی گئیں۔ گالیاں دینے والوں کے

عمل کے غول ان کے پیچھے چھوڑ دیے گئے۔ اور جس فرد یا گروہ نے اس معاملے میں جس قدر عملی سرگرمی کا مظاہرہ کیا اسی نسبت سے حکومت نے اس کی سرپرستی بھی کی اور پیٹھ بھی ٹھونکی۔ ایوب صاحب کے دور میں یوں محسوس ہوتا تھا کہ نشر و اشاعت کے سارے سرکاری اور غیر سرکاری ادارے صرف اسی کام میں مصروف ہیں اور یہ حکومت کے پروگرام کا کوئی بڑا ہی اہم حصہ ہے۔ جو لوگ بھی اس زمانے کے حالات کو دیکھتے رہے ہیں وہ جانتے ہیں کہ پوری حزبِ اختلاف اور اس کے لیڈروں کو بدنام کرنے کے لیے حکومت نے جتنا زور لگایا اس سے کم از کم پچاس گنا زیادہ زور تنہا جماعت اسلامی اور اس کے امیر کو بدنام کرنے کے لیے صرف کر دیا۔

سرمایہ داری جو پہلے ہی عوام پر عذاب کی صورت میں مسلط تھی اس کی ریشہ دوانیوں میں ناقابلِ بیان حد تک اضافہ ہوا۔ ہر وہ فرد جو آمریت کے ہاتھ مضبوط کرنے میں ذرا بھی ممد و معاون ثابت ہوا اس پر دھن برسنے لگا۔ اس بہتی گنگا سے ہر طالع آزما اور مفاد پرست نے خوب دل کھول کر ہاتھ دھوئے۔ ضمیر فروشی کا باقاعدہ کاروبار کھل گیا اور قوم کو اس کی خوب مشق کرائی گئی۔ ملک میں آب پاشی کے نئے نئے منصوبوں کی مدد سے جتنی نئی زمینیں قابلِ کاشت بنائی گئیں وہ کاشت کاروں کو ملنے کے بجائے حکومت کے اور ایوب صاحب کے خوشامدیوں اور بہی خواہوں میں تقسیم کی گئیں اور اس طرح جاگیرداروں کی تعداد میں معتدبہ اضافہ ہوا۔ زرعی اصلاحات جن کا ایوبی دور کے آغاز میں بڑا غلغلہ بلند ہوا تھا، عملی طور پر کسانوں اور مزارعین کی حالت بہتر بنانے میں بالکل ناکام رہیں۔ ان اصلاحات میں ایسے رخنے اور چور دروازے چھوڑ دیے گئے جن سے جاگیردار اچھی طرح فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ چنانچہ ملک کے قریب قریب تمام بڑے زمینداروں نے حکومت کی عافیت میں پناہ لے کر ان سے خوب فائدہ اٹھایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کاشت کاروں کی حالت مزید بگڑ گئی۔

آمریت کا ایک یہ خاصہ بھی ہوتا ہے کہ اس میں نمائشی کام بڑے ذوق و شوق سے کیے جاتے ہیں تاکہ عوام کو ان کے سحر میں گرفتار رکھ کر ترقیات کے تماشے دکھائے جائیں اور اصلی صورتِ حال سے

بے خبر رکھا جائے۔ فیلڈ مارشل صاحب کے دورِ اقتدار میں بھی اسی پالیسی پر بڑے شد و مد کے ساتھ عمل کیا گیا۔ مشہور شہروں اور دار الحکومتوں میں یکایک سر بفلک عمارات اور جدید بستیاں تعمیر کی جانے لگیں۔ بغیر کسی منصوبہ بندی کے مختلف کارخانے قائم کر دیئے گئے اور تجارتی زندگی میں اچانک زبردست ہلچل پیدا ہوئی۔ ان سب کا مقصد ایک ہی تھا کہ ملک کے عوام اور غیر ملکی سیاحوں کے دل و دماغ میں یہ تاثر قائم کیا جائے کہ پاکستان معاشی اعتبار سے حیرت انگیز ترقی کر رہا ہے۔ مگر یہ ساری ترقی اس بگڑے ہوئے رئیس زادے کی سی تھی جو قلاش ہونے کے باوجود محض قرض کے بل بوتے پر اپنی امارت کی جھوٹی ساکھ قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہمارا یہ غریب اور مفلوک الحال ملک اپنے وسائل کے بل پر ان عیاشیوں کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اس نمائشی اقتصادی ترقی کے بھرم کو قائم رکھنے کے لیے دوسرے ممالک سے اندھا دھند قرضے لیے جانے لگے۔ ۱۹۵۸ء یعنی ایوب خان کے اقتدار سے پیشتر پاکستان پر غیر ملکی قرضوں کا بوجھ صرف اٹھاسی کروڑ نو لاکھ تھا۔ مگر ۳۱ دسمبر ۱۹۶۷ء تک قرضے کی رقم دس ارب، اکتیس کروڑ چار لاکھ تک جا پہنچی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ملک کو ہر سال پندرہ کروڑ، پچیس لاکھ روپے کی رقم بطورِ سود ادا کرنی پڑتی ہے۔

اندرونِ ملک بھی مالیاتی نظام بالکل تہ و بالا ہو کر رہ گیا۔ ایک طرف تو محاصل خصوصاً بالواسطہ محاصل، جن کا زیادہ تر بار غریبوں اور متوسط طبقے کو اٹھانا پڑتا ہے، کی بھرمار ہو گئی اور دوسری طرف افراطِ زر نے ضروریاتِ زندگی میں ہوشربا گرانی پیدا کی۔ افراطِ زر نے جس طرح ملکی معیشت کو متاثر کیا ہے اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹ اپریل ۱۹۶۹ء تک چھ ارب، ایک کروڑ ۷۷ لاکھ روپے بطور زرِ گردش میں تھے۔ بنکوں کے اعتباری زر اور قرضے اور تبادلے کے دوسرے مصنوعی ذرائع اس پر مستزاد تھے۔ ان حالات نے غریب طبقوں کے لیے جن معاشی پریشانیوں اور محرومیوں کو جنم دیا ہے اُن کا ہر وہ شخص بخوبی اندازہ کر سکتا ہے جو اس معاشرے میں آنکھیں کھول کر چلتا پھرتا ہے۔

اس ملک کے بے دین عناصر خصوصاً اشتراکیت کے حامیوں نے یوں تو شروع ہی سے عجیب و غریب

طرزِ عمل اختیار کر رکھا تھا مگر خاص طور پر ایوب صاحب کے عہدِ اقتدار میں انہوں نے بڑی چالاکی اور عیاری کے ساتھ اپنے قدم آگے بڑھائے۔ ایک طبقہ تو صدر صاحب کے ساتھ چمٹا رہا اور انہیں غلط سلط مشورے دیکر اُن سے بڑے عاقبت نا اندیشانہ کام کرواتا رہا۔ دوسرا طبقہ اِن مشیروں کی تائید کے ساتھ نشر و اشاعت کے سارے سرکاری اور غیر سرکاری اداروں اور درس گاہوں میں نفوذ کر گیا اور وہاں اس نے حکومت کے وسائل کو غیر اسلامی افکار پھیلانے اور نئی نسل کو گمراہ کرنے میں بے تحاشا استعمال کیا۔ تیسرا طبقہ عوام میں سرایت کرنے لگا اور اس نے انہیں اپنی محرومیوں کا احساس دلا کر ان کے اندر اشتعال پیدا کیا۔ جو کمیونسٹ حکومت کے ایوانوں میں گھسے ہوئے تھے انہوں نے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ مزدوروں میں سوائے ان کے ہم مشربوں کے کسی دوسرے کے لیے کام کرنے کے مواقع قطعاً باقی نہ رہے۔ آمریت نے جو احمقانہ روش اختیار کر رکھی تھی اُس نے بھی اشتراکی حربوں کو مؤثر اور نتیجہ خیز بنانے کے لیے زمین ہموار کی کسی جائز مطالبے کے حصول کے لیے کسی معقول بات کی پذیرائی نہ کی گئی۔ بلکہ ہر معقول مطالبہ حقارت کے ساتھ مسترد کر دیا گیا۔ البتہ جب اُسی مطالبے کو ہنگامہ آرائی اور لاقانونیت کے مظاہروں کے ساتھ پیش کیا گیا تو پھر اُسے درخورِ اعتنا سمجھا گیا جس کا اثر یہ ہوا کہ ملک کی آبادی کے تمام بے چین طبقوں میں یہ احساس پیدا ہوتا چلا گیا کہ جو قیادت جس قدر شدید طوفان اُٹھا سکتی ہو اور جس قدر وسیع پیمانے پر ہنگامے کھڑے کر سکتی ہو وہی اس ملک میں مؤثر اور نتیجہ خیز کردار ادا کر سکتی ہے چنانچہ عوام میں، طلبہ میں، مزدوروں میں، اور مفلس طبقوں میں جس رفتار سے یہ احساس پیدا ہوتا چلا گیا اُسی رفتار سے وہ ایک ایسی قیادت کی طرف دیوانہ وار لپکے جو ہنگامے برپا کرنے میں زیادہ سے زیادہ مہارت رکھتی تھی۔ دوسری طرف نئی اُبھرنے والی قیادت نے بھی قوم کے اس بدلتے ہوئے مزاج کے پیشِ نظر نہ تو اُسے کوئی ٹھوس پروگرام دیا اور نہ کسی تعمیری کام کے لیے اس کی تربیت کی۔ اُس نے اُسے تشدد، غوغا آرائی اور تخریبی کارروائیوں کے لیے تیار کرنے پر سارا زور صرف کر دیا۔ اس نئی قیادت کے ان تخریبی حربوں اور جذباتی نعروں کا ہدف سب سے پہلے خود صدر ایوب صاحب بنے اور اُن کے اپنے رفقاءِ کار اور ان کی اپنی نوکر شاہی نے ملک میں ہنگاموں اور تشدد کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کرا دیا۔ آخر کار فیلڈ مارشل صاحب کی آنکھیں کھُلیں اور وہ جمہوریت بحال کرنے پر آمادہ ہوئے تو معاملات اُن کے ہاتھ سے نکل چکے تھے اور قوم پوری طرح

ہنگامہ برپا کرنے والوں کے پیچھے لگ چکی تھی۔ قانون شکنی، خونریزی، جلاؤ گھیراؤ کے بڑھتے ہوئے رجحانات نے ملک کے اندر شدید خوف و ہراس کی کیفیت پیدا کر دی۔ معاشی سرگرمیاں معطل ہو کر رہ گئیں اور ملک ہر لحاظ سے تباہی کے دہانے پر پہنچ گیا۔ یہ حالات تھے جب مارچ ۱۹۶۹ء میں ملک کے اندر پھر مارشل لا نافذ کرنا پڑا۔ یہ عوام کی ہنگامہ آرائی اور بعض سیاسی لیڈروں کی غیر ذمہ دارانہ روش تھی جس کی بدولت ملک جمہوریت کی منزل کے بالکل قریب پہنچ کر پھر اسی جگہ پلٹ گیا جہاں وہ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں تھا۔

مارشل لا کی نئی حکومت نے اگرچہ جمہوریت کی بحالی کے لیے قوم سے بڑے پُرخلوص وعدے کیے اور اُس نے ان وعدوں کا پہلا مرحلہ بلاشبہ پورا بھی کر دیا ہے مگر اُس سے بعض کوتاہیاں ایسی سرزد ہوئیں جو کافی حد تک موجودہ صورتِ حال کو پیدا کرنے کی موجب بنی ہیں۔ مارشل لا کی حکومت کے لیے دانشمندی کا راستہ یہ تھا کہ جو لوگ ملک کے امن و امان کو غارت کرنے کے ذمہ دار تھے اور ملک کی معاشی مشینری کو معطل کرنے کے درپے تھے اُن کا سختی سے محاسبہ کیا جاتا اور انہیں اس قابل نہ چھوڑا جاتا کہ وہ اس قسم کی تخریب پسندانہ کارروائیاں کرنے کی دوبارہ جرأت کرتے تاکہ ملک میں امن و امان کی ایک فضا قائم ہو جاتی اور عوام کے اندر یہ اعتماد پیدا ہو جاتا کہ اب وہ اطمینان کے ساتھ اپنی قسمت کا فیصلہ خود کر سکیں گے۔ مگر افسوس کہ حکومت نے حالات کی سنگینی کا اندازہ کرنے میں سخت ٹھوکر کھائی۔ تخریب پسند عناصر کھُل کھیلنے میں بالکل آزاد رہے اور اُن سے کسی قسم کی باز پرس کرنے سے حتی الوسع اعراض کیا جاتا رہا۔

مارشل لا حکومت کو دوسرا کام یہ کرنا چاہیے تھا کہ وہ جلد از جلد ۱۹۵۶ء کے آئین کو بحال کر کے جمہوریت کی گاڑی کو اسی مقام پر لا کھڑا کرتی جہاں سے اُسے پٹڑی سے اُتارا گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی ملک میں عام انتخابات کا اعلان کر دیا جاتا۔ مارشل لا کے آغاز میں یہ کام آسانی کے ساتھ کیا جا سکتا تھا۔ اس سے آئین کا مسئلہ ایک طے شدہ مسئلہ بن جاتا، نئے نئے جھگڑوں کے اٹھنے کی راہ بند ہو جاتی، اور سب کی توجہ انتخابات کی طرف منعطف ہو جاتی۔ مگر افسوس کہ اس مشورے کو پذیرائی نہ بخشی گئی۔

نئی حکومت نے تیسری غلطی یہ کی کہ اُس نے ملک کے بہت سے ایسے مسائل کو حل کرنے کا کام اپنے

ذمہ لے لیا جنہیں حل کرنے کی نہ تو وہ استعداد اور تجربہ رکھتی تھی اور نہ اس کی غیر نمائندہ حیثیت ایسا کرنے کی مجاز تھی۔ اِن مسائل میں بعض اہم آئینی مسائل کے آدھورے فیصلے بھی شامل تھے جنہوں نے پیچیدگیوں کو رفع کرنے کے بجائے اور زیادہ پیچیدہ بنا دیا۔

اس کے بعد ملک میں انتخابات کا اعلان کیا بھی گیا تو ایک نئی دستور ساز اسمبلی کے لیے کیا گیا۔ اس کے لیے تقریباً ایک سال کی طویل انتخابی مہم کا دروازہ کھول دیا گیا، اور اس مہم کو قانون و اخلاق کے حدود میں محدود رکھنے کے لیے جو ضابطہ بنایا گیا اس کی عملاً کوئی پابندی نہ کرائی گئی جس کی بدولت ناجائز ہتھکنڈوں سے انتخابات جیتنے کی کوششیں اُس سے بدرجہا زیادہ شدت کے ساتھ کی گئیں جو اکتوبر ۵۸ء سے پہلے کی جا رہی تھیں، بلکہ ان پر غنڈہ گردی، جھوٹے الزامات، اور گندی گالیوں کا اضافہ اتنے بڑے پیمانے پر ہوا جس کی کوئی نظیر اس سے پہلے ہمارے ملک میں نہیں ملتی۔

اِن انتخابات کا جس وقت اعلان ہُوا، اُس وقت ملک میں واضح طور پر تین قسم کے رُجحانات اُبھر کر سامنے آچکے تھے اور انتخابی جدوجہد کے دوران میں وہ پُوری طرح زور پکڑ گئے:

ایک، علاقوں، نسلوں اور زبانوں کے تعصّبات کا رُجحان جو پاکستان کی وحدت و سالمیّت کے لیے خطرناک تھا۔ اِس رُجحان کے پیچھے اگرچہ مختلف علاقوں کی کچھ جائز اور کچھ مبالغہ آمیز شکایات مہمیز کا کام کر رہی تھیں، لیکن درحقیقت اس کی اصل قوتِ محرکہ وہ لادینیت تھی جو قیامِ پاکستان سے پہلے ہی انگریزی دورِ حکومت میں جڑ پکڑ چکی تھی اور قیامِ پاکستان کے بعد ۲۳ سال کے دوران میں تعلیم، تہذیب، سیاست اور معیشت کے غلط نظام کی بدولت مسلسل پرورش پاتی رہی۔ تعلیم یافتہ طبقوں میں، طلبہ میں، سرکاری ملازموں میں، اور نشر و اشاعت کے وسائل میں اس نے بڑے پیمانے پر نفوذ کر لیا تھا۔ اِس رُجحان کے لوگوں نے مُلک کے مختلف حصّوں میں دوسرے علاقوں کے خلاف، اور ایک زبان بولنے والوں میں دوسری زبان بولنے والوں کے خلاف نفرت کا زہر اس شدت سے پھیلایا کہ وہ قبلِ تقسیم کی ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کی باہمی منافرت کی سرحدوں کو چُھو گیا۔ اس کے ساتھ کریلے اور نیم چڑھے کا مصداق یہ ہے کہ اشتراکی رجحانات

رکھنے والوں کا بھی اِس گروہ میں ایک اچھا خاصا طاقتور عنصر شامل تھا۔

دوسرا، اشتراکی رُجحان، جو پاکستان کے بنیادی نظریے ہی کو بدل کر اس ملک کو اسلام کے بجائے مارکس اور لینن اور ماؤ کے اتباع کی طرف پھیر دینا چاہتا تھا۔ یہ رجحان بھی اگرچہ قیامِ پاکستان سے پہلے ہی مسلمانوں کی نئی نسل میں اپنی جڑیں پھیلا چکا تھا، اور قیامِ پاکستان کے بعد بھی کئی سال تک پھیلاتا رہا تھا، لیکن پہلے کبھی اس کو یہ ہمت نہ ہوئی تھی کہ کھل کر سامنے آتا اور یہ دعویٰ لے کر اٹھتا کہ وہ اس ملک کو ایک اشتراکی ریاست بنانا چاہتا ہے۔ یہ ہمت اُس کو اِس وجہ سے ہوئی کہ آمریت کے دس سالوں میں اسے تعلیم گاہوں میں، مزدوروں میں کسانوں میں، نشر و اشاعت کے وسائل میں، سرکاری ملازمین میں، غرض زندگی کے مختلف شعبوں میں نفوذ کرنے کے غیر معمولی مواقع حاصل ہوئے۔ پھر عین اُس وقت جب ۱۹۶۸ء کے آخر میں ایوب خانی آمریت کے خلاف عوامی تحریک پُورے زور کے ساتھ اُٹھی، اس رجحان کے حامی یکایک اُٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے اس موقع کو اپنی سالہا سال کی بوئی ہوئی فصل کاٹنے کا زرّین موقع سمجھ کر تحریکِ جمہوریت کو اشتراکی انقلاب کی طرف موڑنے کے لیے ہنگامے برپا کرنے شروع کر دیئے۔ اِس رجحان کے لوگوں نے کبھی کھلی کھلی اشتراکیت کی دعوت دی، اور کبھی یہ دیکھ کر کہ اِس مسلمان ملک میں یہ دعوت آسانی سے نہیں چل سکتی، اسے اسلامی سوشلزم، اسلامی مساوات، محمدی مساوات وغیرہ کے پردوں میں چھپانے کی کوشش کی۔ اس کے ساتھ انہوں نے عوام کو طرح طرح کے فریب دینے شروع کیے تاکہ وہ لالچ میں آکر اِن کے آلۂ کار بن جائیں۔ کسانوں سے کہا کہ ہم ہر کسان کو ۱۲½ ایکڑ زمین دینگے۔ کرایہ داروں سے کہا کہ ہم تمہیں اُن مکانات کا مالک بنا دینگے جن میں تم کرائے سے رہتے ہو۔ ٹیکسیوں اور رکشاؤں کے چلانے والوں سے کہا کہ جن ٹیکسیوں اور رکشاؤں کو تم اُجرت پر چلاتے ہو وہ تمہاری ہی ملکیت میں دے دی جائیں گی۔ غریب طبقوں کے لوگوں سے وعدہ کیا کہ ہم اُن کے کچے مکان پختہ بنوادیں گے اور بڑی بڑی کوٹھیاں ان کو بانٹ دیں گے۔ مزدوروں کو امید دلائی کہ وہی کارخانوں کے مالک بنا دیئے جائیں گے۔ حد یہ ہے کہ لوگوں کو مُفت حج کرانے اور کنواروں کی شادیاں کرا دینے کے سبز باغ بھی دکھائے گئے۔ اس گروہ کی سب سے زیادہ مدد بلکہ اُس گروہ نے کی جو اخبارات میں ہزاروی گروپ کے نام سے معروف ہے۔ ان لوگوں نے اشتراکیوں کو

پورا پورا مذہبی تحفظ فراہم کیا۔ مسلم عوام کو یہ اطمینان دلایا کہ اس اشتراکیت سے اسلام کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔ اُن علماء کی سخت مذمت کی جنہوں نے سوشلزم کو کفر قرار دیا تھا اور انہیں امریکی ایجنٹ اور سرمایہ داروں کا ایجنٹ قرار دیا۔ یہ لوگ اشتراکیوں کی یہ خدمت آخر وقت تک انجام دیتے رہے، یہاں تک کہ جب انہوں نے اِن کے فراہم کردہ مذہبی تحفظ سے پورا پورا فائدہ اٹھا لیا، تو سیاسی اقتدار میں اِن کو حصّہ دینے سے صاف انکار کر دیا اور اس کے بعد یہ حضرات یکایک سوشلزم کے مخالف اور اسلام کے علمبردار بن کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔

تیسرا رُجحان پاکستان کو ایک وحدت بنا کر رکھنے اور اس کی اسلامی حیثیت کو برقرار رکھنے کا تھا، جس کی پُشت پر برِصغیر ہند و پاکستان کی پُوری اسلامی تاریخ اور روایات، قیامِ پاکستان کے اصل محرکات و اسباب، اور سب سے بڑھ کر اسلام کی تعلیمات کارفرما تھیں، اور اِس رُجحان کی طاقت کا انحصار عامۃ المسلمین کے اسلامی جذبات پر تھا جو اُن کے اندر بگاڑ پیدا کرنے کی تمام کوششوں کے باوجود اب بھی خدا کے فضل سے کافی مضبوط ہیں۔

اب ایک نگاہ ڈال کر یہ بھی دیکھ لیجیے کہ انتخابات کے موقع پر اِن رُجحانات کی حامل کون کون سی اور کتنی پارٹیاں میدان میں آئیں اور ان کی پوزیشن کیا تھی۔

پہلے اور دوسرے رُجحان کی حامل مشرقی پاکستان میں چھ پارٹیاں تھیں۔ ایک عوامی لیگ دوسری نیپ (ولی خاں گروپ)۔ تیسری نیپ (بھاشانی گروپ)۔ چوتھی پاکستان نیشنل لیگ (عطاء الرحمٰن گروپ)۔ پانچویں کرشک سرامک پارٹی چھٹی جمعیت علماء اسلام (ہزاروی گروپ) کی مشرقی پاکستانی شاخ جو اسلام کا نام لینے کے ساتھ بنگالی قوم پرستی کی بھی حامی تھی اور مذکورۂ بالا جماعتوں کے اندر اشتراکی رجحانات رکھنے والے عناصر کو بھی مذہبی تحفظ فراہم کر رہی تھی۔ اِن میں سے چار پارٹیاں انتخابات سے پہلے ہی میدان سے ہٹ گئیں۔ صرف ولی خان گروپ نے مشرقی پاکستان کی ۱۶۲ نشستوں میں سے ۳۶ کے لیے اپنے آدمی کھڑے کیے اور ان کے لیے بھی کامیابی کے امکانات مفقود تھے اس طرح عملاً پورے مشرقی پاکستان میں صرف ایک ہی پارٹی اِن رُجحانات کی علمبردار کی حیثیت سے انتخابات میں مقابلہ کر رہی تھی، اور وہ تھی عوامی لیگ جس نے مشرقی پاکستان کی تمام نشستوں پر اپنے آدمی کھڑے کیے تھے۔ سرکاری ملازمین کی عظیم اکثریت اس کی

حامی تھی۔ طلبہ، نوجوانوں اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں کا ایک مضبوط گروپ اس کے ساتھ تھا، مالی وسائل اس کے پاس اس قدر بے تحاشا تھے کہ یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ صرف پاکستانی صنعتکار و سرمایہ دار اتنے وسائل مہیا کر سکتے تھے، ہندو رائے دہندگان بالاتفاق اسکی تائید کر رہے تھے، ان میں کسی کا ووٹ بھی کسی ایسی پارٹی کی طرف جانے والا نہ تھا جو پاکستان کی وحدت اور اس میں اسلامی نظام قائم کرنے کی حامی ہو، اور پونے دو سال کے دوران میں نہ صرف بیرونی ذرائع نشر و اشاعت سے، بلکہ خود حکومت کے رویہ سے بھی یہ بات عوام کے ذہن نشین ہو گئی تھی کہ یہی پارٹی برسرِ اقتدار آ رہی ہے

مغربی پاکستان میں اِن رجحانات کی حامل سات پارٹیاں تھیں۔ ایک عوامی لیگ جس نے یہاں برائے نام صرف سات آدمی کھڑے کیے تھے اور ان کے لیے کامیابی کے امکانات کا سرے سے کوئی سوال ہی نہ تھا۔ دوسری نیپ بھاشانی گروپ جس نے پورے مغربی پاکستان سے صرف پانچ آدمی کھڑے کیے۔ تیسری سندھ متحدہ محاذ جس کا صرف ایک آدمی سندھ سے کھڑا ہوا یہی حال چوتھی پارٹی نیپ (پختونستانی گروپ) اور پانچویں پارٹی بلوچستان متحدہ محاذ کا بھی تھا کہ ان کا بھی صرف ایک ہی ایک آدمی میدان میں آیا۔ چھٹی پارٹی نیپ ولی خاں گروپ ہے نے پنجاب سے کوئی آدمی کھڑا نہیں کیا، سندھ سے وہ صرف ۲ آدمی لے کر آئی، اور اس نے اپنی تمام تر توجہ سرحد اور بلوچستان تک محدود رکھی۔ اس طرح عملاً پنجاب اور سندھ اِن رجحانات کی حامل پارٹیوں میں سے صرف ایک پارٹی پیپلز پارٹی کے لیے مخصوص ہو گئے جہاں اس کا اپنے ہم مشربوں سے اگر کوئی مقابلہ تھا بھی تو وہ برائے نام تھا۔ "غریب نواز" سوشلسٹ اور بڑے بڑے صنعتکار، سرمایہ دار، جاگیردار اور وڈیرے اسکی حمایت پر جمع تھے۔ قادیانیوں کی پوری جماعت نے اپنے زیرِ زمین اور بالائے زمین سرکاری و نیم سرکاری اور غیر سرکاری سب وسائل اس کو کامیاب کرانے کے لیے صرف کر دیئے۔ اسلامی حکومت جن جن کی نگاہ میں بھی ناقابلِ قبول تھی، وہ سب بھی اسکی حمایت پر کمربستہ ہو گئے۔ عوام میں سوشلزم اور نام نہاد "اسلامی سوشلزم" کے خلاف نفرت جو اس کی راہ میں کاوٹ بن سکتی تھی، اس کو دور کرنے میں ہزاروی گروپ کے علماء نے بیش بہا خدمات انجام دیں اور اس گھاٹ پر قادیانی اور "ختمِ نبوت" کے علمبردار ایک ساتھ پانی پیتے نظر آئے۔ غریب طبقوں کو جس بڑے پیمانے پر دھوکے دیئے گئے ان کے کچھ نمونے ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ رہا پیسہ تو وہ اس پارٹی نے پچھلے پونے دو سال میں جس بے تحاشا طریقے سے استعمال کیا اس کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا مشکل ہے کہ صرف پاکستانی ذرائع سے اتنے مالی وسائل بہم پہنچ سکتے تھے۔

اس کے بعد ذرا اُن لوگوں کا حال بھی دیکھ لیجیے جو پاکستان کی وحدت و سالمیت اور اس کی اسلامی حیثیت کی حفاظت کے لیے اُٹھے تھے۔ اُن کے سامنے یہ بات ایک حقیقتِ واقعیہ کی حیثیت سے موجود تھی کہ مخالف رجحانات کی تمام طاقتیں مشرقی پاکستان میں صرف عوامی لیگ پر، پنجاب و سندھ میں تمام تر پیپلز پارٹی پر اور سرحد و بلوچستان میں نیپ ولی خان گروپ پر مجتمع ہیں لیکن یہ دیکھتے ہوئے

بھی ایک ہی مقصد کی حمایت کا دعویٰ کرنیوالی ۱۲ جماعتیں (جن کیلیے اخبارات میں "اسلام پسند" کا نام رائج ہو گیا ہے) ان کا مقابلہ کرنے کے لیے میدان میں آ گئیں۔ ان پر مزید ڈیڑھ ہزار آزاد امیدوار بھی جن میں سے اکثر "اسلام پسندی" کے مدعی تھے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ انتخابی مقابلہ میں یہ سب ایک دوسرے کی تردید کرتے رہے اور جہاں تک جماعت اسلامی کا تعلق ہے، اس کی مخالفت میں بیرونی ممالک کا پریس، اندرونِ ملک کے صوبائیت پرست، اشتراکی، قادیانی، ہزاروی، منکرینِ حدیث، مغرب زدگی کی بنا پر اسلام سے چِڑ رکھنے والے اور "اسلام پسند" گروہ، سب متفق ہو گئے، حالانکہ پورے ملک میں اسلامی محاذ سے اگر کوئی جماعت ان تینوں پارٹیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے موزوں ترین تھی تو وہ صرف جماعت اسلامی ہی تھی۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ ان تمام جماعتوں کا الگ الگ جائزہ لیں جو "اسلام پسند" کے نام سے موسوم کی جاتی ہیں:

چار جماعتیں ایسی ہیں جن کا پورا احترام ملحوظ رکھنے کے باوجود ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ انہوں نے الگ اپنے نمائندے کھڑے کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کی۔ ایک، جمعیت اہلِ حدیث جس نے صرف پنجاب سے دو آدمی کھڑے کیے۔ دوسری، خاکسار تحریک کہ وہ بھی صرف پنجاب سے دو آدمی لیکر اُٹھی۔ تیسری، اسلامی جمہوری پارٹی، جو صرف مشرقی پاکستان سے پانچ آدمی لیکر کھڑی ہوئی۔ چوتھی سندھ کسان مہاجر پنجابی پٹھان متحدہ محاذ جس نے پنجاب سے صرف ایک آدمی کھڑا کیا اور سندھ سے پانچ۔ سوال یہ ہے کہ ۳۱۳ کے ایوان میں جسے ملک کے لیے آئین بنانا تھا، اِن چھوٹی چھوٹی علاقائی جماعتوں کا دو چار آدمی لے کر انتخابات کے میدان میں آجانا آخر کیا فائدہ رکھتا تھا؟ کیا یہ جماعتیں اپنی انفرادی حیثیت میں اُس طوفان کا مقابلہ کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہیں جو پورے ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے اور اس کو اسلام کے راستے سے ہٹا کر لادینی اور اشتراکیت کے راستے پر لے جانے کے لیے بڑی خوفناک طاقت کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا ہے؟

اس کے بعد جمعیۃ علمائے پاکستان کو لیجیے جو "اہلِ سنت" اور "سیالوی گروپ" کے نام سے بھی معروف ہے۔ یہ جماعت سنہ ۱۹۷۰ میں انتخابات کا اعلان ہونے کے بھی کئی مہینے بعد یکایک اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی کوئی کل پاکستان حیثیت نہیں ہے۔ سرحد سے اس نے صرف ایک آدمی کھڑا کیا، پنجاب سے ۲۹، اور سندھ سے ۸۔ مشرقی پاکستان میں اس کا کوئی وجود نہیں بلوچستان میں بھی اس کا کوئی آدمی نہیں۔ کیا یہ جماعت ملک کو متحد رکھنے اور اس کی اسلامی حیثیت کو برقرار رکھنے کے لیے کافی طاقت رکھتی تھی؟ پھر جن اسباب سے اس ملک میں لادینی اور اشتراکیت اور علیحدگی پسندی کے رجحانات نے زور پکڑا ہے ان کے مقابلے میں اس جماعت کے پاس پیری مُریدی اور چند مخصوص مذہبی فروعات کے سوا اور کیا پروگرام ہے؟ کیا دنیا میں کہیں بھی دورِ جدید کے ان فتنوں کا مقابلہ پیری مریدی اور اِن مذہبی فروعات کے بل پر کیا جا سکا ہے؟ ترکستان میں پیروں کی کوئی کمی نہ تھی لیکن اشتراکیت کا سیلاب جب آیا تو تمام بڑی بڑی گدیوں کو بہالے گیا، مریدوں ہی کے ہاتھوں، پیروں کا خاتمہ کرا دیا گیا۔ (باقی صفحہ ۲۳)

تفہیم القرآن

المُرسَلات

نام | پہلی ہی آیت کے لفظ وَالْمُرْسَلٰتِ کو اس سورۃ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول | اس کا پورا مضمون یہ ظاہر کر رہا ہے کہ یہ مکۂ معظمہ کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہے۔ اس سے پہلے کی دو سورتیں سورۂ قیامہ، اور سورۂ دہر، اور اس کے بعد کی دو سورتیں، سورۃ نبا اور سورۂ نازِعات اگر ملا کر پڑھی جائیں تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب ایک ہی دور کی نازل شدہ سورتیں ہیں اور ایک ہی مضمون ہے جس کو ان میں مختلف پیرایوں سے اہل مکہ کے ذہن نشین کرایا گیا ہے۔

موضوع اور مضمون | اس کا موضوع قیامت اور آخرت کا اِثبات، اور اُن نتائج سے لوگوں کو خبردار کرنا ہے جو اِن حقائق کے انکار اور اقرار سے آخر کار برآمد ہونگے۔

پہلی سات آیتوں میں ہواؤں کے انتظام کو اس حقیقت پر گواہ قرار دیا گیا ہے کہ قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس قیامت کے آنے کی خبر دے رہے ہیں وہ ضرور واقع ہو کر رہے گی۔ اِن میں اِستدلال یہ ہے کہ جس قادرِ مطلق نے زمین پر یہ حیرت انگیز انتظام قائم کیا ہے اُس کی قدرت قیامت برپا کرنے سے عاجز نہیں ہو سکتی، اور جو صریح حکمت اِس انتظام میں کارفرما نظر آرہی ہے وہ اِس بات کی شہادت دیتی ہے کہ آخرت ضرور ہونی چاہیے، کیونکہ حکیم کا کوئی فعل عبث اور بے مقصد نہیں ہو سکتا، اور آخرت نہ ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ سارا کارخانۂ ہستی سراسر

فضول ہے۔

اہلِ مکہ بار بار کہتے تھے کہ جس قیامت سے تم ہم کو ڈرا رہے ہو اسے لاکر دکھاؤ تب ہم اسے مانیں گے۔ آیت ۸ سے ۱۵ تک ان کے اس مطالبے کا ذکر کیے بغیر اس کا جواب دیا گیا ہے کہ وہ کوئی کھیل یا تماشا تو نہیں ہے کہ جب کوئی مسخرا اسے دکھانے کا مطالبہ کرے اسی وقت وہ فوراً دکھا دیا جائے۔ وہ تو تمام نوعِ انسانی، اور اس کے تمام افراد کے مقدمے کے فیصلے کا دن ہے۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک خاص وقت مقرر کر رکھا ہے۔ اسی وقت پر وہ دن آئے گا۔ اور جب آئے گا تو ایسی ہولناک شکل میں آئے گا کہ آج جو لوگ مذاق کے طور پر اس کا مطالبہ کر رہے ہیں اس وقت اُن کے حواس باختہ ہو جائیں گے۔ اُس وقت اُنہی رسولوں کی شہادت پر ان کے مقدمے کا فیصلہ ہوگا جن کی دی ہوئی خبر کو یہ منکرین آج بڑی بے باکی کے ساتھ جھٹلا رہے ہیں، پھر انہیں خود پتہ چل جائے گا کہ انہوں نے کس طرح خود اپنے ہاتھوں اپنی تباہی کا سامان کیا ہے۔

آیت ۱۶ سے ۲۸ تک مسلسل قیامت اور آخرت کے وقوع اور وجوب کے دلائل دیئے گئے ہیں۔ ان میں بتایا گیا ہے کہ انسان کی اپنی تاریخ، اس کی اپنی پیدائش، اور جس زمین پر وہ زندگی بسر کر رہا ہے اس کی اپنی ساخت اس بات کی شہادت دے رہی ہے کہ قیامت کا آنا اور عالمِ آخرت کا برپا ہونا ممکن بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا بھی۔ انسانی تاریخ بتا رہی ہے کہ جن قوموں نے بھی آخرت کا انکار کیا وہ آخر کار بگڑیں اور تباہی سے دوچار ہوئیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آخرت ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کسی قوم کا رویہ اگر متصادم ہو تو اس کا انجام وہی ہوتا ہے جو اُس اندھے کا انجام ہوتا ہے جو سامنے سے آتی ہوئی گاڑی کے مقابلے میں بگٹٹ چلا جا رہا ہو۔ اور اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ کائنات کی سلطنت میں صرف قوانینِ طبیعی (PHYSICAL LAWS) ہی کار فرما نہیں ہیں بلکہ ایک قانونِ اخلاقی (MORAL LAW) بھی کام کر رہا ہے جس کے تحت خود اس دنیا میں بھی مکافاتِ عمل کا سلسلہ جاری ہے لیکن

دنیا کی موجودہ زندگی میں یہ مکافات چونکہ اپنی کامل و مکمل صورت میں واقع نہیں ہو رہی ہے اس لیے کائنات کا اخلاقی قانون لازماً یہ تقاضا کرتا ہے کہ کوئی وقت ایسا آئے جب یہ بھرپور طریقے سے واقع ہو اور اُن تمام بھلائیوں اور بُرائیوں کی پوری جزا و سزا دی جائے جو یہاں جزا سے محروم رہ گئی ہیں یا سزا سے بچ نکلی ہیں۔ اس کے لیے ناگزیر ہے کہ موت کے بعد دوسری زندگی ہو۔ اور انسان کی پیدائش دنیا میں جس طرح ہوتی ہے اس پر اگر انسان غور کرے تو اس کی عقل ـــ بشرطیکہ وہ سلیم ہو ـــ اس بات کو ماننے سے انکار نہیں کر سکتی کہ جس خدا نے ایک حقیر نطفہ سے ابتدا کر کے اُسے پورا آدمی بنایا ہے اُس کے لیے اُسی آدمی کو پھر پیدا کر دینا یقیناً ممکن ہے۔ زندگی بھر انسان جس زمین پر رہتا ہے، مرنے کے بعد اس کے اجزائے جسم کہیں غائب نہیں ہو جاتے، اِسی زمین پر ان کا ایک ایک ذرّہ موجود رہتا ہے۔ اسی زمین کے خزانوں سے وہ بنتا اور پھلتا پھولتا اور پرورش پاتا ہے، اور پھر اسی زمین کے خزانوں میں واپس جمع ہو جاتا ہے۔ جس خدا نے اُسے پہلے زمین کے اِن خزانوں سے نکالا تھا وہی ان میں جمع ہو جانے کے بعد اُسے پھر ان سے نکال لا سکتا ہے۔ اُس کی قدرت پر غور کرو تو تم اِس سے انکار نہیں کر سکتے کہ وہ ایسا کر سکتا ہے۔ اور اس کی حکمت پر غور کرو تو تم اس سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ زمین پر جو اختیارات اُس نے تمہیں دیئے ہیں اُن کے صحیح اور غلط استعمال کا حساب لینا یقیناً اس کی حکمت کا تقاضا ہے اور بلا حساب چھوڑ دینا سراسر حکمت کے خلاف ہے۔

اس کے بعد آیات ۴۱ سے ۵۰ تک آخرت کے منکرین کا، اور ۵۱ سے ۵۷ تک ان لوگوں کا انجام بیان کیا گیا ہے جنہوں نے اس پر ایمان لا کر دنیا میں اپنی عاقبت سنوارنے کی کوشش کی ہے اور عقائد و افکار، اخلاق و اعمال، اور سیرت و کردار کی اُن برائیوں سے اجتناب کیا ہے جو چاہے آدمی کی دنیا بناتی ہوں مگر اس کی عاقبت خراب کر دینے والی ہوں۔

آخر میں منکرینِ آخرت اور خدا کی بندگی سے منہ موڑنے والوں کو متنبّہ کیا گیا ہے کہ دنیا کی چند روزہ زندگی میں جو کچھ مزے اڑانے ہیں اڑا لو، آخر کار تمہارا انجام سخت تباہ کن ہو گا۔ اور بات اِس پر ختم

کی گئی ہے کہ اِس قرآن سے بھی جو شخص ہدایت نہ پائے اسے پھر دنیا میں کوئی چیز ہدایت نہیں دے سکتی۔

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے

قسم ہے اُن (ہواؤں) کی جو پے در پے بھیجی جاتی ہیں، پھر طوفانی رفتار سے چلتی ہیں اور (بادلوں کو) اٹھا کر پھیلاتی ہیں، پھر (اُن کو) پھاڑ کر جدا کرتی ہیں، پھر (دلوں میں خدا کی) یاد ڈالتی ہیں عذر کے طور پر یا ڈراوے کے طور پر،[1] جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے[2] وہ ضرور واقع ہونے والی ہے۔[3]

---

[1] یعنی کبھی تو ان کی آمد کے رُکنے اور قحط کا خطرہ پیدا ہونے سے دل گداز ہوتے ہیں اور لوگ اللہ سے توبہ و استغفار کرنے لگتے ہیں۔ کبھی اُن کے باران رحمت لانے پر لوگ اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ اور کبھی ان کی طوفانی سختی دلوں میں خوف پیدا کرتی ہے اور تباہی کے ڈر سے لوگ خدا کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

[2] دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "جس چیز کا تمہیں خوف دلایا جا رہا ہے"۔ مراد ہے قیامت اور آخرت۔

[3] یہاں قیامت کے ضرور واقع ہونے پر پانچ چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے۔ ایک، اَلْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا "پے در پے، یا بھلائی کے طور پر بھیجی جانے والیاں"۔ دوسرے، اَلْعٰصِفٰتِ عَصْفًا "بہت تیزی اور شدت کے ساتھ چلنے والیاں"۔ تیسرے، اَلنّٰشِرٰتِ نَشْرًا "خوب پھیلانے والیاں"۔ چوتھے، اَلْفٰرِقٰتِ فَرْقًا "الگ الگ کرنے والیاں"۔ پانچویں، اَلْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا "یاد کا اِلقا کرنے والیاں"۔ چونکہ اِن الفاظ میں صرف صفات بیان کی گئی ہیں، اور یہ صراحت نہیں کی گئی ہے کہ یہ کس چیز یا کن چیزوں کی صفات ہیں، اس لیے مفسرین کے درمیان اس امر میں اختلاف ہوا ہے کہ آیا یہ پانچوں صفات ایک ہی چیز کی ہیں، یا الگ الگ چیزوں کی، اور وہ چیز یا چیزیں کیا ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ پانچوں سے مراد ہوائیں ہیں۔ دوسرا کہتا ہے پانچوں سے مراد فرشتے ہیں۔ تیسرا کہتا ہے پہلے تین سے مراد ہوائیں ہیں اور باقی دو سے مراد فرشتے۔ چوتھا کہتا ہے پہلے دو سے مراد ہوائیں اور باقی تین سے مراد فرشتے ہیں۔ اور ایک گروہ کی رائے یہ بھی ہے کہ پہلی سے مراد ملائکۂ رحمت، دوسرے سے مراد ملائکۂ عذاب اور باقی تین سے مراد قرآن مجید کی آیات ہیں۔

ہمارے نزدیک پہلی بات تو یہ قابلِ غور ہے کہ جب ایک ہی سلسلۂ کلام میں پانچ صفات کا مسلسل ذکر کیا گیا ہے

اور کوئی علامت بیچ میں ایسی نہیں پائی جاتی جس سے یہ سمجھا جا سکے کہ کہاں تک ایک چیز کی صفات کا ذکر ہے اور کہاں سے دوسری چیز کی صفات کا ذکر شروع ہوا ہے۔ تو یہ کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ محض کسی بے بنیاد قیاس کی بنا پر ہم یہ سمجھ لیں کہ یہاں دو یا تین مختلف چیزوں کی قسمیں کھائی گئی ہیں، بلکہ اس صورت میں نظمِ کلام خود اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ پوری عبارت کو کسی ایک ہی چیز کی صفات سے متعلق مانا جائے۔ دوسری بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں بھی شک یا انکار کرنے والوں کو کسی حقیقتِ غیر محسوس کا یقین دلانے کے لیے کسی چیز، یا بعض چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے وہاں قسم دراصل استدلال کی ہم معنی ہوتی ہے، یعنی اس سے مقصود یہ بتانا ہوتا ہے کہ یہ چیز یا چیزیں اُس حقیقت کے صحیح و برحق ہونے پر دلالت کر رہی ہیں۔ اِس غرض کے لیے ظاہر ہے کہ ایک غیر محسوس شے کے حق میں کسی دوسری غیر محسوس شے کو بطورِ استدلال پیش کرنا درست نہیں ہو سکتا، بلکہ غیر محسوس پر محسوس سے دلیل لانا ہی موزوں اور مناسب ہو سکتا ہے۔ اس لیے ہماری رائے میں صحیح تفسیر یہی ہے کہ اس سے مراد ہوائیں ہیں، اور اُن لوگوں کی تفسیر قابلِ قبول نہیں ہے جنہوں نے ان پانچوں چیزوں سے مراد فرشتے لیے ہیں، کیونکہ وہ بھی اُسی طرح غیر محسوس ہیں جس طرح قیامت کا وقوع غیر محسوس ہے۔

اب غور کیجیے کہ قیامت کے وقوع پر ہواؤں کی یہ کیفیات کس طرح دلالت کرتی ہیں۔ زمین پر جن اسباب سے حیوانی اور نباتی زندگی ممکن ہوئی ہے ان میں سے ایک نہایت اہم سبب ہوا ہے۔ ہر نوع کی زندگی سے اُس کی صفات کا جو تعلق ہے وہ بجائے خود اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ کوئی قادرِ مطلق اور صانعِ حکیم ہے جس نے اِس کُرۂ خاکی پر زندگی کو وجود میں لانے کا ارادہ کیا اور اِس غرض کے لیے یہاں ایک ایسی چیز پیدا کی جس کی صفات زندہ مخلوقات کے وجود کی ضروریات کے ساتھ ٹھیک ٹھیک مطابقت رکھتی ہیں۔ پھر اُس نے صرف اتنا ہی نہیں کیا ہے کہ زمین کو ہوا کا ایک لبادہ اُڑھا کر چھوڑ دیا ہو، بلکہ اپنی قدرت اور حکمت سے اِس ہوا میں اس نے بے شمار مختلف کیفیات پیدا کی ہیں جن کا انتظام لاکھوں کروڑوں برس سے اس طرح ہو رہا ہے کہ انہی کی بدولت موسم پیدا ہوتے ہیں، کبھی حبس ہوتا ہے اور کبھی بادِ نسیم چلتی ہے، کبھی گرمی آتی ہے اور کبھی سردی، کبھی بادل آتے ہیں اور کبھی آتے ہوئے بادل اُڑ جاتے ہیں، کبھی نہایت خوشگوار جھونکے چلتے ہیں اور کبھی انتہائی تباہ کُن طوفان آ جاتے ہیں، کبھی نہایت نفع بخش بارش ہوتی ہے اور کبھی کال پڑ جاتا ہے۔ غرض ایک ہوا نہیں بلکہ طرح

پھر جب ستارے ماند پڑ جائیں گے[۴]، اور آسمان پھاڑ دیا جائے گا[۵]، اور پہاڑ دھنک ڈالے جائیں گے، اور رسولوں کی حاضری کا وقت آ پہنچے گا[۶] (اس روز وہ چیز واقع ہو جائے گی)۔ کس روز کے لیے یہ کام اٹھا رکھا گیا ہے؟ فیصلے کے روز کے لیے۔ اور تمہیں کیا خبر کہ وہ فیصلے کا دن کیا ہے؟ تباہی ہے اُس دن جھٹلانے والوں کے لیے[۷]۔

طرح کی ہوائیں ہیں جو اپنے وقت پر چلتی ہیں اور ہر ہوا کسی نہ کسی مقصد کو پورا کرتی ہے۔ یہ انتظام ایک غالب قدرت کا ثبوت ہے جس کے لیے نہ زندگی کو وجود میں لانا خارج از امکان ہو سکتا ہے، نہ اسے مٹا دینا، اور نہ مٹا کر دوبارہ وجود میں لے آنا۔ اسی طرح یہ انتظام کمال درجہ حکمت و دانائی کا ثبوت بھی ہے، جس سے صرف ایک نادان آدمی ہی یہ توقع رکھ سکتا ہے کہ یہ سارا کاروبار محض کھیل کے طور پر کیا جا رہا ہو اور اس کا کوئی عظیم تر مقصد نہ ہو۔ اس حیرت انگیز انتظام کے مقابلے میں انسان اتنا بےبس ہے کہ کبھی وہ نہ اپنے لیے مفید مطلب ہوا چلا سکتا ہے نہ اپنے اوپر ہلاکت خیز ہوا کا طوفان آنے کو روک سکتا ہے۔ وہ خواہ کتنی ہی ڈھٹائی اور بےشعوری اور ضد اور ہٹ دھرمی سے کام لے، کبھی نہ کبھی یہی ہوا اس کو یاد دلا دیتی ہے کہ اوپر کوئی زبردست اقتدار کارفرما ہے جو زندگی کے اس سب سے بڑے ذریعہ کو جب چاہے اس کے لیے رحمت اور جب چاہے ہلاکت کا سبب بنا سکتا ہے، اور انسان اس کے کسی فیصلے کو بھی روک دینے کی طاقت نہیں رکھتا۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد چہارم، الجاثیہ، حاشیہ ۷۔ جلد پنجم، الذاریات، حواشی ۱ تا ۴)۔

[۴] یعنی وہ بے نور ہو جائیں گے اور ان کی روشنی ختم ہو جائے گی۔

[۵] یعنی عالم بالا کا وہ بندھا ہوا انتظام، جس کی بدولت ہر ستارہ اور سیارہ اپنے مدار پر قائم ہے، اور جس کی بدولت کائنات کی ہر چیز اپنی اپنی حد میں رکی ہوئی ہے، توڑ ڈالا جائے گا اور اس کی ساری بندشیں کھول دی جائیں گی۔

[۶] قرآن کریم میں متعدد مقامات پر یہ بات بیان کی گئی ہے کہ میدانِ حشر میں جب نوعِ انسانی کا مقدمہ پیش ہوگا تو ہر قوم کے رسول کو شہادت کے لیے پیش کیا جائے گا تاکہ وہ اس امر کی گواہی دے کہ اس نے اللہ کا پیغام ان لوگوں تک پہنچا دیا تھا۔ یہ گمراہوں اور مجرموں کے خلاف اللہ کی سب سے پہلی اور سب سے بڑی حجت ہوگی جس سے

کیا ہم نے اگلوں کو ہلاک نہیں کیا؟[۸] پھر انہی کے پیچھے ہم بعد والوں کو چلتا کریں گے۔[۹] مجرموں کے ساتھ ہم یہی کچھ کیا کرتے ہیں۔ تباہی ہے اُس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔[۱۰]
کیا ہم نے ایک حقیر پانی سے تمہیں پیدا نہیں کیا اور ایک مُقرّرہ مدت تک[۱۱] اسے ایک محفوظ جگہ

یہ ثابت کیا جائے گا کہ وہ اپنی غلط روش کے خود ذمہ دار ہیں ورنہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو خبردار کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی گئی تھی۔ مثال کے طور پر حسبِ ذیل مقامات ملاحظہ ہوں: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، آیات ۱۷۲، ۱۷۳۔ حواشی ۱۳۴، ۱۳۵۔ جلد چہارم، الزمر، آیت ۶۹، حاشیہ ۸۰۔ جلد پنجم، الملک، آیت ۸، حاشیہ ۱۴۔

[۷] یعنی اُن لوگوں کے لیے جنہوں نے اُس دن کے آنے کی خبر کو جھوٹ سمجھا اور دنیا میں یہ سمجھتے ہوئے زندگی بسر کرتے رہے کہ کبھی وہ وقت نہیں آنا ہے جب انہیں اپنے خدا کے سامنے حاضر ہو کر اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہو گی۔

[۸] یہ آخرت کے حق میں تاریخی استدلال ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خود اسی دنیا میں اپنی تاریخ کو دیکھ لو۔ جن قوموں نے بھی آخرت کا انکار کر کے اسی دنیا کو اصل زندگی سمجھا اور اِسی دنیا میں ظاہر ہونے والے نتائج کو خیر و شر کا معیار سمجھ کر اپنا اخلاقی رویہ متعین کیا، بلا استثناء وہ سب آخر کار تباہ ہو کر رہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آخرت فی الواقع ایک حقیقت ہے جسے نظر انداز کر کے کام کرنے والا اُسی طرح نقصان اٹھاتا ہے جس طرح ہر اُس شخص کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے جو حقائق سے آنکھیں بند کر کے چلے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، یونس، حاشیہ ۱۲۔ جلد سوم، النمل، حاشیہ ۸۶۔ الروم، حاشیہ ۸۔ جلد چہارم، سبا، حاشیہ ۲۵)

[۹] یعنی یہ ہمارا مستقل قانون ہے۔ آخرت کا انکار جس طرح پہلے گزری ہوئی قوموں کے لیے تباہ کن ثابت ہوا ہے، اسی طرح آگے آنے والی قوموں کے لیے بھی یہ ہمیشہ تباہ کن ہی ثابت ہو گا۔ اس سے کوئی قوم بھی نہ پہلے مستثنیٰ تھی نہ آئندہ کبھی ہو گی۔

[۱۰] یہاں یہ فقرہ اس معنی میں ارشاد ہوا ہے کہ دنیا میں اُن کا جو انجام ہوا ہے یا آئندہ ہو گا وہ ان کی اصل سزا نہیں ہے، بلکہ اصل تباہی تو اُن پر فیصلے کے دن نازل ہو گی۔ یہاں کی پکڑ تو صرف یہ حیثیت رکھتی ہے کہ جب کوئی شخص مسلسل جرائم کرتا چلا جاتا ہے اور کسی طرح اپنی بگڑی ہوئی روش سے باز نہ آئے تو آخر کار اسے گرفتار

ٹھیرائے رکھا[۲۲]، تو دیکھو، ہم اس پر قادر تھے، پس ہم بہت اچھی قدرت رکھنے والے ہیں[۲۳]۔ تباہی ہے اُس روز جھٹلانے والوں کے لیے[۲۴]۔

کر لیا جائے۔ عدالت، جہاں اس کے مقدمے کا فیصلہ ہونا ہے اور اسے اس کے تمام کرتوتوں کی سزا دی جانی ہے، اِس دنیا میں قائم نہیں ہو گی بلکہ آخرت میں ہو گی، اور وہی اُس کی تباہی کا اصل دن ہو گا۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم، الاعراف، حواشی ۵-۶۔ ہود، حاشیہ ۱۰۵)۔

۲۱ اصل الفاظ ہیں قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ۔ اس کا صرف یہی مطلب نہیں ہے کہ وہ مُدّت مُقرّر ہے، بلکہ اس میں یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ اس کی مُدّت اللہ ہی کو معلوم ہے۔ کسی بچے کے متعلق کسی ذریعہ سے بھی انسان کو یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ وہ کتنے مہینے، کتنے دن کتنے گھنٹے اور کتنے منٹ اور سکنڈ ماں کے پیٹ میں رہے گا، اور اس کا ٹھیک وقتِ ولادت کیا ہو گا۔ اللہ ہی نے ہر بچے کے لیے ایک خاص مدت مقرر کی ہے اور وہی اس کو جانتا ہے۔

۲۲ یعنی رحمِ مادر، جس میں استقرارِ حمل ہوتے ہی بچے کو اتنی مضبوطی کے ساتھ جمایا جاتا ہے اور اتنے انتظامات اس کی حفاظت اور پرورش کے کیے جاتے ہیں کہ کسی شدید حادثے کے بغیر اس کا اسقاط نہیں ہو سکتا، اور مصنوعی اسقاط کے لیے بھی غیر معمولی تدابیر اختیار کرنی پڑتی ہیں جو فنِ طب کی جدید ترقیات کے باوجود خطرے اور نقصان سے خالی نہیں ہیں۔

۲۳ یہ حیات بعدِ موت کے امکان کی صریح دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جب ہم ایک حقیر نطفے سے تمہاری ابتدا کر کے تمہیں پُورا انسان بنانے پر قادر تھے، تو آخر دوبارہ تمہیں کسی اور طرح پیدا کر دینے پر کیوں قادر نہ ہوں گے؟ ہماری یہ تخلیق، جس کے نتیجے میں تم آج زندہ موجود ہو، خود اس بات کا ثبوت ہے کہ ہم بہت اچھی قدرت رکھنے والے ہیں، ایسے عاجز نہیں ہیں کہ ایک دفعہ پیدا کر کے پھر تمہیں پیدا نہ کر سکیں۔

۲۴ یہاں یہ فقرہ اس معنی میں ارشاد ہوا ہے کہ امکانِ حیات بعدِ موت کی یہ صریح دلیل سامنے موجود ہوتے ہوئے بھی جو لوگ اس کو جھٹلا رہے ہیں، وہ آج اس کا جتنا چاہیں مذاق اڑا لیں، اور جس قدر چاہیں اس کے ماننے والوں کو دقیانوسی، تاریک خیال اور اوہام پرست قرار دیتے ہیں، مگر جب وہ دن آجائے گا جسے یہ

کیا ہم نے زمین کو سمیٹ کر رکھنے والی نہیں بنایا، زندوں کے لیے بھی اور مُردوں کے لیے بھی، اور اس میں بلند و بالا پہاڑ جمائے، اور تمہیں میٹھا پانی پلایا؟[۱۵] تباہی ہے اس روز جھٹلانے والوں کے لیے۔[۱۶]

چلو[۱۷] اب اُسی چیز کی طرف جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔ چلو اُس سائے کی طرف جو تین شاخوں والا ہے،[۱۸]

جھٹلا رہے ہیں تو انہیں خود معلوم ہو جائے گا کہ یہ ان کے لیے تباہی کا دن ہے۔

[۱۵] یہ آخرت کے ممکن اور معقول ہونے پر ایک اور دلیل ہے۔ یہی ایک کرۂ زمین ہے جو کروڑوں اور اربوں سال سے بے حد و حساب مخلوقات کو اپنی گود میں لیے ہوئے ہے، ہر قسم کی نباتات، ہر قسم کے حیوانات اور انسان اس پر جی رہے ہیں، اور سب کی ضروریات پُوری کرنے کے لیے اِس کے پیٹ میں سے طرح طرح کے اَتھاہ خزانے نکلتے چلے آ رہے ہیں۔ پھر یہی زمین ہے جس پر ان تمام اقسام کی مخلوقات کے بے شمار افراد روز مرتے ہیں، مگر ایسا بے نظیر انتظام کر دیا گیا ہے کہ سب کے لاشے اِسی زمین میں ٹھکانے لگ جاتے ہیں اور یہ پھر ہر مخلوق کے نئے افراد کے جینے اور بسنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ اِس زمین کو سپاٹ گیند کی طرح بھی بنا کر نہیں رکھ دیا گیا ہے بلکہ اس میں جگہ جگہ پہاڑی سلسلے اور فلک بوس پہاڑ قائم کیے گئے ہیں جن کا موسموں کے تغیرات میں، بارشوں کے برسنے میں، دریاؤں کی پیدائش میں، زرخیز وادیوں کے وجود میں، بڑے بڑے شہتیر فراہم کرنے والے درختوں کے اُگنے میں، قسم قسم کی معدنیات اور طرح طرح کے پتھروں کی فراہمی میں بہت بڑا دخل ہے۔ پھر اس زمین کے پیٹ میں بھی میٹھا پانی پیدا کیا گیا ہے، اِس کی پیٹھ پر بھی میٹھے پانی کی نہریں بہا دی گئی ہیں، اور سمندر کے کھاری پانی سے صاف سُتھرے بخارات اٹھا کر بھی نِتھرا ہُوا پانی آسمان سے برسانے کا انتظام کیا گیا ہے۔ کیا یہ سب اِس بات کی دلیل نہیں ہے کہ ایک قادرِ مطلق نے یہ سب کچھ بنایا ہے، اور وہ محض قادر ہی نہیں ہے بلکہ علیم و حکیم بھی ہے؟ اب اگر اس کی قدرت اور حکمت ہی سے یہ زمین اس سر و سامان کے ساتھ اور اِن حکمتوں کے ساتھ بنی ہے تو ایک صاحبِ عقل آدمی کو یہ سمجھنے میں کیوں مشکل پیش آتی ہے کہ اُسی کی قدرت اِس دنیا کی بساط لپیٹ کر پھر ایک دوسری دنیا نئے طرز پر بنا سکتی ہے، اور اُس کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اِس کے بعد ایک دوسری دنیا بنائے تاکہ انسان سے اُن اعمال کا حساب لے جو اُس نے اِس دنیا میں کیے ہیں؟

[۱۶] یہاں یہ فقرہ اس معنی میں ارشاد ہُوا ہے کہ جو لوگ خدا کی قدرت اور حکمت کے یہ کرشمے دیکھ کر بھی آخرت

نہ ٹھنڈک پہنچانے والا اور نہ آگ کی لپیٹ سے بچانے والا۔ وہ آگ محل جیسی بڑی بڑی چنگاریاں پھینکے گی
(جو اچھلتی ہوئی یوں محسوس ہوں گی) گویا کہ وہ زرد اونٹ ہیں[19]۔ تباہی ہے اُس روز جھٹلانے والوں کے لیے۔
یہ وہ دن ہے جس میں وہ نہ کچھ بولیں گے اور نہ اُنہیں موقع دیا جائیگا کہ کوئی عذر پیش کریں[20]۔ تباہی ہے اُس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔
یہ فیصلے کا دن ہے۔ ہم نے تمہیں اور تم سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو جمع کر دیا ہے۔ اب اگر
کوئی چال تم چل سکتے ہو تو میرے مقابلہ میں چل دیکھو[21]۔ تباہی ہے اُس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔ ع

کے ممکن اور معقول ہونے کا انکار کر رہے ہیں اور اِس بات کو جھٹلا رہے ہیں کہ خدا اِس دنیا کے بعد ایک دوسری دنیا پیدا کرے گا اور اُس میں انسان سے اُس کے اعمال کا حساب لے گا، وہ اپنی اِس خام خیالی میں مگن رہنا چاہتے ہیں تو رہیں۔ جس روز یہ سب کچھ ان کی توقعات کے خلاف پیش آجائے گا اس روز انہیں پتہ چل جائے گا کہ انہوں نے یہ حماقت کر کے خود اپنے لیے تباہی مول لی ہے۔

۱۷؎ اب آخرت کے دلائل دینے کے بعد یہ بتایا جا رہا ہے کہ جب وہ واقع ہو جائیگی تو ان منکرین کا حشر کیا ہوگا۔

۱۸؎ سائے سے مراد دھوئیں کا سایہ ہے۔ اور تین شاخوں کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی بہت بڑا دھواں اُٹھتا ہے تو اوپر جا کر وہ کئی شاخوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔

۱۹؎ یعنی ہر چنگاری ایک قصر جیسی بڑی ہو گی، اور جب یہ بڑی بڑی چنگاریاں اُٹھ کر پھٹیں گی اور چاروں طرف اُڑنے لگیں گی تو یوں محسوس ہو گا جیسے زرد رنگ کے اونٹ اُچھل کود کر رہے ہیں۔

۲۰؎ یہ اُن کی آخری حالت ہو گی جو جہنم میں داخلہ کے وقت اُن پر طاری ہو گی۔ اُس سے پہلے میدانِ حشر میں تو یہ لوگ بہت کچھ کہیں گے، بہت سی معذرتیں پیش کریں گے، ایک دوسرے پر اپنے قصوروں کا الزام ڈال کر خود بے قصور بننے کی کوشش کریں گے، اپنے گمراہ کرنے والے سرداروں اور پیشواؤں کو گالیاں دیں گے، حتیٰ کہ بعض لوگ پوری ڈھٹائی کے ساتھ اپنے جرائم کا انکار تک کر گزریں گے، جیسا کہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بیان ہوا ہے۔ مگر جب تمام شہادتوں سے اُن کا مجرم ہونا پوری طرح ثابت کر دیا جائے گا، اور جب ان کے اپنے ہاتھ پاؤں اور ان کے اعضاء تک ان کے خلاف گواہی دے کر ثبوتِ جرم میں کوئی کسر نہ چھوڑیں گے، اور جب بالکل بجا اور برحق طریقے سے عدل و انصاف کے تمام تقاضے پورے کر کے انہیں سزا سنا دی جائے گی تو وہ دم بخود رہ جائیں گے، اور ان کے لیے

متقی لوگ[۲۲] آج سایوں اور چشموں میں ہیں اور جو پھل وہ چاہیں (ان کے لیے حاضر ہیں)۔ کھاؤ اور پیو مزے سے اپنے اُن اعمال کے صلے میں جو تم کرتے رہے ہو۔ ہم نیک لوگوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ تباہی ہے اُس روز جھٹلانے والوں کے لیے[۲۳]۔

کھالو[۲۴] اور مزے کر لو تھوڑے دن[۲۵]۔ حقیقت میں تم لوگ مجرم ہو۔ تباہی ہے اُس روز جھٹلانے والوں

اپنی معذرت میں کچھ کہنے کی گنجائش باقی نہ رہے گی۔ عذر پیش کرنے کا موقع نہ دینے یا اس کی اجازت نہ دینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صفائی کا موقع دیئے بغیر ان کے خلاف فیصلہ صادر کر دیا جائے گا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا جرم اِس طرح قطعی ناقابلِ انکار حد تک ثابت کر دیا جائے گا کہ وہ اپنی معذرت میں کچھ نہ کہہ سکیں گے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ہم کہتے ہیں کہ مَیں نے اُس کو بولنے نہیں دیا، یا مَیں نے اس کی زبان بند کر دی، اور اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مَیں نے اس پر ایسی حجت تمام کی کہ اُس کے لیے زبان کھولنے یا کچھ بولنے کا کوئی موقع باقی نہ رہا۔

۲۱؎ یعنی دنیا میں تو تم بہت مکّاریاں اور چالبازیاں کرتے رہے، اب یہاں کوئی چال چل کر میری پکڑ سے بچ سکتے ہو تو ذرا بچ دکھاؤ۔

۲۲؎ چونکہ یہ لفظ یہاں مکذبین (جھٹلانے والوں) کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے اس لیے متقیوں سے مراد اس جگہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے آخرت کو جھٹلانے سے پرہیز کیا اور اُس کو مان کر دنیا میں یہ سمجھتے ہوئے زندگی بسر کی کہ ہمیں آخرت میں اپنے اقوال و افعال اور اپنے اخلاق و کردار کی جواب دہی کرنی ہوگی۔

۲۳؎ یہاں یہ فقرہ اس معنی میں ارشاد ہوا ہے کہ اُن کے لیے ایک مصیبت تو وہ ہوگی جو اوپر بیان ہو چکی ہے کہ میدانِ حشر میں وہ مجرموں کی حیثیت سے کھڑے ہوں گے، علی الاعلان ان کے جرائم اس طرح ثابت کر دیئے جائیں گے کہ ان کے لیے زبان کھولنے تک کا یارا نہ رہے گا، اور آخرکار جہنم کا ایندھن بن کر رہیں گے۔ دوسری مصیبت بالائے مصیبت یہ ہوگی کہ وہی ایمان لانے والے جن سے ان کی عمر بھر لڑائی رہی، جنہیں وہ بیوقوف اور تنگ خیال اور رجعت پسند کہتے رہے، جن کا وہ مذاق اڑاتے رہے اور جنہیں اپنے نزدیک حقیر و ذلیل سمجھتے رہے انہی کو وہ جنت میں مزے اڑاتے دیکھیں گے۔

۲۴؎ اب کلام ختم کرتے ہوئے نہ صرف کفارِ مکہ کو بلکہ دنیا کے تمام کفار کو مخاطب کرتے ہوئے یہ کلمات

کے لیے۔ جب اِن سے کہا جاتا ہے کہ (اللہ کے آگے) جھکو تو نہیں جھکتے۔[۲۶] تباہی ہے اس روز جھٹلانے والوں

کے لیے۔ اب اِس (قرآن) کے بعد اور کونسا کلام ایسا ہو سکتا ہے جس پر یہ ایمان لائیں؟[۲۷] ع

ارشاد فرماتے جا رہے ہیں۔

۲۵ یعنی دنیا کی اس چند روزہ زندگی میں۔

۲۶ اللہ کے آگے جھکنے سے مراد صرف اس کی عبادت کرنا ہی نہیں ہے، بلکہ اس کے بھیجے ہوئے رسول اور اس کی نازل کردہ کتاب کو ماننا اور اس کے احکام کی اطاعت کرنا بھی اس میں شامل ہے۔

۲۷ یعنی جو بڑی سے بڑی چیز انسان کو حق و باطل کا فرق سمجھانے والی اور ہدایت کا راستہ دکھانے والی ہو سکتی تھی وہ قرآن کی صورت میں نازل کر دی گئی ہے۔ اس کو پڑھ کر یا سن کر بھی اگر کوئی شخص ایمان نہیں لاتا تو اس کے بعد پھر اور کیا چیز ایسی ہو سکتی ہے جو اس کو راہِ راست پر لا سکے؟

تفہیم القرآن

النبا

نام | دوسری آیت کے فقرے عَنِ النَّبَاِ الْعَظِیْمِ کے لفظ اَلنَّبَا کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے، اور یہ صرف نام ہی نہیں ہے بلکہ اس سورۃ کے مضامین کا عنوان بھی ہے، کیونکہ نبا سے مراد قیامت اور آخرت کی خبر ہے اور سورۃ میں ساری بحث اسی پر کی گئی ہے۔

زمانۂ نزول | جیسا کہ ہم سورۃ مرسلات کے دیباچے میں بیان کر چکے ہیں، سورۂ قیامت سے سورۂ نازعات تک سب کا مضمون ایک دوسرے سے مشابہ ہے اور یہ سب مکہ معظمہ کے ابتدائی دور کی نازل شدہ معلوم ہوتی ہیں۔

موضوع اور مضمون | اس کا مضمون بھی وہی ہے جو سورۂ مرسلات کا ہے، یعنی قیامت اور آخرت کا اثبات، اور اس کو ماننے یا نہ ماننے کے نتائج سے لوگوں کو خبردار کرنا۔

مکہ معظمہ میں جب اول اول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی تبلیغ کا آغاز کیا تو اس کی بنیاد تین چیزیں تھیں۔ ایک یہ بات کہ اللہ کے ساتھ کسی کو خدائی میں شریک نہ مانا جائے۔ دوسری یہ کہ آپ کو اللہ نے اپنا رسول مقرر کیا ہے۔ تیسری یہ کہ اس دنیا کا ایک روز خاتمہ ہو جائے گا اور اس کے بعد ایک دوسرا عالم برپا ہوگا جس میں تمام اولین و آخرین دوبارہ زندہ کر کے اسی جسم کے ساتھ اٹھائے جائیں گے جس میں رہ کر انہوں نے دنیا میں کام کیا تھا، پھر ان کے عقائد اور اعمال کا حساب لیا جائے گا اور اس محاسبہ میں جو لوگ مومن و صالح ثابت ہوں گے وہ ہمیشہ کے لیے جنت

میں جائیں گے اور جو کافر و فاسق ہوں گے وہ ہمیشہ کے لیے دوزخ میں رہیں گے۔ اِن تینوں باتوں میں سے پہلی بات اگرچہ اہلِ مکہ کو سخت ناگوار تھی، لیکن بہر حال وہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کے منکر نہ تھے، اُس کے ربِّ اعلیٰ اور خالق و رازق ہونے کو بھی مانتے تھے، اور یہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ دوسرے جن جن کو وہ معبود قرار دیتے ہیں وہ اللہ ہی کی مخلوق ہیں، اس لیے جھگڑا صرف اِس امر میں تھا کہ خدائی کی صفات و اختیارات میں اور اُلوہیت کی ذات میں اُن کی کوئی شرکت ہے یا نہیں۔ دوسری بات کو مکے کے لوگ ماننے کے لیے تیار نہ تھے، مگر اِس امر سے انکار کرنا ان کے لیے ممکن نہ تھا کہ چالیس سال تک جو زندگی حضورؐ نے دعوائے رسالت سے پہلے اُنہی کے درمیان گزاری تھی، اس میں انہوں نے کبھی آپ کو جھوٹا یا فریب کار، یا نفسانی اغراض کے لیے ناجائز طریقے اختیار کرنے والا نہ پایا تھا۔ وہ خود آپ کی دانائی و فرزانگی، سلامت روی اور اخلاق کی بلندی کے قائل و معترف تھے۔ اس لیے ہزار بہانے اور الزامات تراشنے کے باوجود انہیں دوسروں کو باور کرانا تو درکنار، اپنی جگہ خود بھی یہ باور کرنے میں سخت مشکل پیش آرہی تھی کہ حضورؐ سارے معاملات میں تو راستباز ہیں مگر صرف رسالت کے دعوے میں معاذاللہ جھوٹے ہیں۔ اِس طرح پہلی دو باتیں اہلِ مکہ کے لیے دراصل اتنی زیادہ اُلجھن کی موجب نہ تھیں جتنی تیسری بات تھی۔ اُس کو جب اُن کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے سب سے زیادہ اُسی کا مذاق اڑایا، اُسی پر سب سے بڑھ کر حیرانی اور تعجب کا اظہار کیا، اور اُسے بالکل بعید از عقل و امکان سمجھ کر جگہ جگہ اس کے ناقابلِ یقین بلکہ ناقابلِ تصور ہونے کے چرچے شروع کر دیئے۔ مگر اسلام کی راہ پر اُن کو لانے کے لیے یہ قطعی ناگزیر تھا کہ آخرت کا عقیدہ اُن کے ذہن میں اُتارا جائے، کیونکہ اِس عقیدے کو مانے بغیر یہ ممکن ہی نہ تھا کہ حق اور باطل کے معاملہ میں اُن کا طرزِ فکر سنجیدہ ہو سکتا، خیر و شر کے معاملہ میں ان کا معیارِ اقدار بدل سکتا، اور وہ دنیا پرستی کی راہ چھوڑ کر اُس راہ پر ایک قدم بھی چل سکتے جس پر اسلام ان کو چلانا چاہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مکہ معظمہ کے ابتدائی دَور کی سُورتوں میں زیادہ تر زور آخرت کا عقیدہ دلوں میں بٹھانے پر صرف کیا گیا ہے، البتہ اس کے لیے دلائل ایسے انداز سے دیئے گئے ہیں جن سے توحید کا

تصوّر بھی خود بخود ذہن نشین ہوتا چلا جاتا ہے، اور بیچ بیچ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے برحق ہونے کے دلائل بھی مختصراً دے دیئے گئے ہیں۔

اِس دَور کی سُورتوں میں آخرت کے مضمون کی اِس تکرار کا سبب اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد اب اِس سُورۃ کے مضامین پر ایک نگاہ ڈال لیجیے۔ اِس میں سب سے پہلے اُن چرچوں اور چہ میگوئیوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو قیامت کی خبر سُن کر مکّہ کے ہر کوچہ و بازار اور اہلِ مکّہ کی ہر محفل میں ہو رہی تھیں۔ اس کے بعد انکار کرنے والوں سے پوچھا گیا ہے کہ کیا تمہیں یہ زمین نظر نہیں آتی جسے ہم نے تمہارے لیے فرش بنا رکھا ہے؟ کیا یہ بلند و بالا پہاڑ تمہیں نظر نہیں آتے جنہیں ہم نے زمین میں گاڑ رکھا ہے؟ کیا تم اپنے آپ کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح ہم نے تمہیں مردوں اور عورتوں کے جوڑوں کی شکل میں پیدا کیا ہے؟ کیا تم اپنی نیند کو نہیں دیکھتے جس کے ذریعہ سے ہم نے تم کو دنیا میں کام کرنے کے قابل بنائے رکھنے کے لیے ہر چند گھنٹوں کی محنت کے بعد ہر چند گھنٹے آرام لینے پر مجبور کر رکھا ہے؟ کیا تم رات اور دن کی آمد و رفت کو نہیں دیکھتے جسے ٹھیک تمہاری ضرورت کے مطابق ہم باقاعدگی کے ساتھ مسلسل جاری رکھے ہوئے ہیں؟ کیا تم اپنے اوپر آسمانوں کے مضبوط بندھے ہوئے نظام کو نہیں دیکھتے؟ کیا یہ سُورج تمہیں نظر نہیں آتا جس کی بدولت تمہیں روشنی اور حرارت میسّر آ رہی ہے؟ کیا تم اُن بارشوں کو نہیں دیکھتے جو بادلوں سے برس رہی ہیں اور اِن کے ذریعہ سے غلّے اور سبزیاں اور گھنے باغ اُگ رہے ہیں؟ یہ ساری چیزیں کیا تمہیں یہی بتا رہی ہیں کہ جس قادرِ مطلق نے اِن کو پیدا کیا ہے اُس کی قدرت قیامت لانے اور آخرت برپا کرنے سے عاجز ہے؟ اور اِس پُورے کارخانے میں جو کمال درجے کی حکمت و دانائی صریحاً کارفرما ہے کیا اس کو دیکھتے ہوئے تمہاری سمجھ میں یہی آتا ہے کہ اِس کارخانے کا ایک ایک جُز اور ایک ایک فعل تو بامقصد ہے مگر بجائے خود پُورا کارخانہ بے مقصد ہے؟ آخر اس سے زیادہ لغو اور بے معنی بات کیا ہو سکتی ہے کہ اس کارخانے میں انسان کو پیش دست (FOREMAN) کے منصب پر مامور کر کے اسے یہاں بڑے وسیع اختیارات تو دے دیے جائیں مگر جب وہ اپنا کام

پورا کر کے یہاں سے رخصت ہو تو اسے یونہی چھوڑ دیا جائے؟ نہ کام بنانے پر پنشن اور انعام، نہ کام بگاڑنے پر باز پُرس اور سزا؟

یہ دلائل دینے کے بعد پُورے زور کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ فیصلے کا دن یقیناً اپنے مقرر وقت پر آ کر رہے گا۔ صور میں بس ایک پھونک مارنے کی دیر ہے، وہ سب کچھ جس کی تمہیں خبر دی جا رہی ہے سامنے آ جائے گا اور تم آج چاہے مانو یا نہ مانو، اُس وقت جہاں جہاں بھی تم مرے پڑے ہوگے وہاں سے فوج در فوج اپنا حساب دینے کے لیے نکل آؤ گے۔ تمہارا انکار اس واقعہ کو پیش آنے سے نہیں روک سکتا۔

اس کے بعد آیت ۲۱ سے ۳۰ تک بتایا گیا ہے کہ جو لوگ کسی حساب کتاب کی توقع نہیں رکھتے اور جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلا دیا ہے، ان کا ایک ایک کرتوت گِن گِن کر ہمارے ہاں لکھا ہُوا ہے، اور اُن کی خبر لینے کے لیے جہنم گھات لگائے ہوئے تیار ہے جہاں ان کے اعمال کا بھرپُور بدلہ انہیں دے دیا جائے گا۔ پھر آیت ۳۱ سے ۳۶ تک اُن لوگوں کی بہترین جزا بتائی گئی ہے جنہوں نے اپنے آپ کو ذمّہ دار و جوابدہ سمجھ کر دنیا میں اپنی آخرت درست کرنے کی پہلے ہی فکر کر لی ہے، اور انہیں اطمینان دلایا گیا ہے کہ انہیں ان کی خدمات کا صرف اجر ہی نہیں دیا جائیگا۔ بلکہ اس سے زائد کافی انعام بھی دیا جائے گا۔

آخر میں خدا کی عدالت کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ وہاں کسی کے اَڑ کر بیٹھ جانے اور اپنے متوسّلین کو بخشوا کر چھوڑنے کا کیا سوال، کوئی بلا اجازت زبان تک نہ کھول سکے گا، اور اجازت بھی اِس شرط کے ساتھ ملے گی کہ جس کے حق میں سفارش کا اِذن ہو صرف اسی کے لیے سفارش کرے اور سفارش میں کوئی بے جا بات نہ کہے۔ نیز سفارش کی اجازت صرف ان لوگوں کے حق میں دی جائے گی جو دنیا میں کلمۂ حق کے قائل رہے ہیں اور محض گناہ گار ہیں، خدا کے باغی اور حق کے مُنکر کسی سفارش کے مستحق نہ ہونگے۔

پھر کلام کو اِس تنبیہ پر ختم کیا گیا ہے کہ جس دن کے آنے کی خبر دی جا رہی ہے اُس کا آنا

برحق ہے، اُسے دُور نہ سمجھو، وہ قریب ہی آلگا ہے، اب جس کا جی چاہے اسے مان کر اپنے رب کا راستہ اختیار کرلے۔ لیکن اس تنبیہ کے باوجود جو اُس کا انکار کرے گا اس کا سارا کیا دھرا اُس کے سامنے آجائے گا اور پھر وہ پچھتا پچھتا کر کہے گا کہ کاش مَیں دنیا میں پیدا ہی نہ ہوتا۔ اُس وقت اُس کا یہ احساس اُسی دنیا کے بارے میں ہوگا جس پر وہ آج لٹو ہو رہا ہے۔

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے

یہ لوگ کس چیز کے بارے میں پُوچھ گچھ کر رہے ہیں؟ کیا اُس بڑی خبر کے بارے میں جس کے متعلق یہ مختلف چہ میگوئیاں کرنے میں لگے ہوئے ہیں[۱]؟ ہرگز نہیں[۲]، عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا۔ ہاں، ہرگز نہیں، عنقریب

---

[۱] بڑی خبر سے مراد قیامت اور آخرت کی خبر ہے جس کو اہل مکہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سنتے تھے، پھر ہر محفل میں اس پر طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہوتی تھیں۔ پُوچھ گچھ سے مراد یہی چہ میگوئیاں ہیں۔ لوگ جب ایک دوسرے سے ملتے تھے تو کہتے تھے کہ بھائی، کبھی پہلے بھی تم نے سنا ہے کہ مر کے کوئی دوبارہ زندہ ہوگا؟ کیا یہ ماننے کے قابل بات ہے کہ گل سڑ کر جو ہڈیاں ریزہ ریزہ ہو چکی ہیں ان میں نئے سرے سے جان پڑ جائیگی؟ کیا عقل میں یہ بات سماتی ہے کہ اگلی پچھلی ساری نسلیں اُٹھ کر ایک جگہ جمع ہونگی؟ کیا یہ ممکن ہے کہ یہ بڑے بڑے جمے ہوئے پہاڑ ہوا میں روئی کے گالوں کی طرح اڑنے لگیں گے؟ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ چاند سورج اور تارے سب بُجھ کر رہ جائیں اور دنیا کا یہ سارا جما جمایا نظام اُلٹ پلٹ ہو جائے؟ یہ صاحب جو کل تک اچھے خاصے دانا آدمی تھے آج انہیں یہ کیا ہو گیا ہے کہ ہمیں ایسی عجیب انہونی خبریں سُنا رہے ہیں۔ یہ جنت اور یہ دوزخ آخر پہلے کہاں تھیں جن کا ذکر ہم نے کبھی ان کی زبان سے نہ سنا تھا؟ اب یہ ایک دم کہاں سے نکل آئی ہیں کہ انہوں نے ان کے عجیب و غریب نقشے ہمارے سامنے کھینچنے شروع کر دیئے ہیں؟

ھُمْ فِیْهِ مُخْتَلِفُوْنَ کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ "وہ اس کے بارے میں مختلف چہ میگوئیاں کر رہے ہیں"۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دنیا کے انجام کے بارے میں یہ لوگ خود بھی کوئی ایک متفق علیہ عقیدہ نہیں رکھتے بلکہ "ان کے درمیان اس کے متعلق مختلف خیالات پائے جاتے ہیں"۔ اُن میں سے کوئی عیسائیوں کے خیالات سے متاثر تھا اور زندگی بعد موت کو مانتا تھا مگر یہ سمجھتا تھا کہ وہ ... نی نہیں بلکہ روحانی ہوگی۔ کوئی آخرت کا

انہیں معلوم ہو جائے گا۔ ۳؎

کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے زمین کو فرش بنایا ۴؎، اور پہاڑوں کو میخوں کی طرح گاڑ دیا ۵؎، اور تمہیں

قطعی منکر نہ تھا مگر اسے شک تھا کہ وہ ہو سکتی ہے یا نہیں، چنانچہ قرآن مجید ہی میں اس خیال کے لوگوں کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَیْقِنِیْنَ، "ہم تو بس ایک گمان سا رکھتے ہیں، یقین ہم کو نہیں ہے" (الجاثیہ آیت ۳۲) اور کوئی بالکل صاف صاف کہتا تھا کہ اِنْ ھِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِیْنَ "جو کچھ بھی ہے بس ہماری یہی دنیا کی زندگی ہے اور ہم ہرگز مرنے کے بعد دوبارہ نہ اٹھائے جائیں گے" (الانعام۔ آیت ۲۹)۔ پھر کچھ لوگ ان میں سے دہریے تھے اور کہتے تھے کہ مَا ھِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَنَحْیَا وَمَا یُھْلِکُنَآ اِلَّا الدَّھْرُ "زندگی بس یہی ہماری دنیا کی زندگی ہے، یہیں ہم مرتے اور جیتے ہیں اور گردشِ ایام کے سوا کوئی چیز نہیں جو ہمیں ہلاک کرتی ہو" (الجاثیہ۔ ۲۴)۔ اور کچھ دوسرے لوگ دہریے تو نہ تھے مگر دوسری زندگی کو ناممکن قرار دیتے تھے، یعنی ان کے نزدیک یہ خدا کی قدرت سے خارج تھا کہ وہ مرے ہوئے انسانوں کو پھر سے زندہ کر سکے۔ ان کا قول تھا مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَھِیَ رَمِیْمٌ، "کون ان ہڈیوں کو زندہ کرے گا جبکہ یہ بوسیدہ ہو چکی ہوں؟" (یٰس۔ ۷۸)۔ یہ ان کے مختلف اقوال خود ہی اس بات کا ثبوت تھے کہ ان کے پاس اِس مسئلے میں کوئی علم نہ تھا، بلکہ وہ محض گمان و قیاس کے تیر تکّے چلا رہے تھے، ورنہ علم ہوتا تو سب کسی ایک بات کے قائل ہوتے (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد پنجم، الذاریات، حاشیہ ۶)۔

۲؎ یعنی آخرت کے متعلق جو باتیں یہ لوگ بنا رہے ہیں سب غلط ہیں۔ جو کچھ انہوں نے سمجھ رکھا ہے وہ ہرگز صحیح نہیں ہے۔

۳؎ یعنی وہ وقت دُور نہیں ہے جب وہی چیز حقیقت بن کر اِن کے سامنے آجائے گی جس کے بارے میں یہ فضول چہ میگوئیاں کر رہے ہیں۔ اُس وقت اِنہیں پتہ چل جائے گا کہ رسُول نے جو خبر ان کو دی تھی وہی صحیح تھی اور قیاس و گمان سے جو باتیں یہ بنا رہے تھے ان کی کوئی حقیقت نہ تھی۔

۴؎ زمین کو انسان کے لیے فرش، یعنی ایک پُر سکون قیام گاہ بنانے میں قدرت و حکمت کے جو کمالات کارفرما ہیں ان پر اس سے پہلے تفہیم القرآن میں متعدد مقامات پر تفصیلی روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ مثال کے طور پر مقاماتِ ذیل

(مردوں اور عورتوں کے) جوڑوں کی شکل میں پیدا کیا[۶]، اور تمہاری نیند کو باعثِ سکون بنایا[۷]، اور رات کو پردہ پوش اور دن کو معاش کا وقت بنایا[۸]، اور تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان قائم کیے[۹]، اور ایک

ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد سوم، النمل، حواشی ۷۴، ۷۷-۸۱-جلد چہارم، یٰس، حاشیہ ۲۹-المؤمن، حواشی ۹۰-۹۱-الزخرف، حاشیہ ۷-الجاثیہ، حاشیہ ۷-جلد پنجم، قٓ، حاشیہ ۱۸-

۵؎ زمین پر پہاڑ پیدا کرنے کی حکمتوں کے متعلق ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم، النحل، حاشیہ ۱۲، جلد سوم النمل حاشیہ ۷۴-جلد پنجم، المرسلات، حاشیہ ۱۵-

۶؎ انسان کو مردوں اور عورتوں کے جوڑوں کی شکل میں پیدا کرنا اپنے اندر جو عظیم حکمتیں رکھتا ہے ان کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد سوم، الفرقان، حاشیہ ۶۹، الروم، حواشی ۲۸ تا ۳۰-جلد چہارم، یٰس، حاشیہ ۳۱-الشوریٰ، حاشیہ ۷۷-الزخرف، حاشیہ ۱۲-جلد پنجم، القیامہ، حاشیہ ۲۵-

۷؎ انسان کو دنیا میں کام کرنے کے قابل بنانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے جس حکمت کے ساتھ اس کی فطرت میں نیند کا ایک ایسا داعیہ رکھ دیا ہے جو ہر چند گھنٹوں کی محنت کے بعد اسے چند گھنٹے سونے پر مجبور کر دیتا ہے اس کی تشریح ہم تفہیم القرآن، جلد سوم-الروم، حاشیہ ۳۳ میں کر چکے ہیں-

۸؎ یعنی رات کو اِس غرض کے لیے تاریک بنا دیا کہ اس میں تم روشنی سے محفوظ رہ کر زیادہ آسانی کے ساتھ نیند کا سکون حاصل کر سکو، اور دن کو اِس مقصد سے روشن بنایا کہ اس میں تم زیادہ سہولت کے ساتھ اپنی معاش کے لیے کام کر سکو- زمین پر باقاعدگی کے ساتھ مسلسل رات اور دن کا اُلٹ پھیر کرتے رہنے کے بے شمار فوائد میں سے صرف اِس ایک فائدے کی طرف اشارہ یہ بتانے کے لیے کیا گیا ہے کہ یہ سب کچھ بے مقصد، یا اتفاقاً نہیں ہو رہا ہے بلکہ اس کے پیچھے ایک بڑی حکمت کام کر رہی ہے جس کا براہِ راست تمہارے اپنے مفاد سے گہرا تعلق ہے-تمہارے وجود کی ساخت اپنے سکون و راحت کے لیے جس تاریکی کی طالب تھی وہ رات کو، اور اپنی معیشت کے لیے جس روشنی کی طالب تھی وہ دن کو مہیا کی گئی ہے-تمہاری ضروریات کے عین مطابق یہ انتظام خود اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ یہ کسی حکیم کی حکمت کے بغیر نہیں ہوا ہے-(مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم، یونس، حاشیہ ۶۵-جلد چہارم، یٰس، حاشیہ ۳۲-المؤمن، حاشیہ ۸۵-الزخرف، حاشیہ ۴)-

نہایت روشن اور گرم چراغ پیدا کیا،[۱۰] اور بادلوں سے لگاتار بارش برسائی تاکہ اس کے ذریعہ سے غلّہ اور سبزی اور گھنے باغ اگائیں؟[۱۱]

۹؎ مضبوط کا لفظ اس معنی میں استعمال کیا گیا ہے کہ اُن کی سرحدیں اتنی مستحکم ہیں کہ ان میں ذرہ برابر تغیر و تبدل نہیں ہونے پاتا اور ان سرحدوں کو پار کر کے عالم بالا کے بے شمار ستاروں اور سیاروں میں سے کوئی نہ ایک دوسرے سے ٹکراتا ہے نہ تمہاری زمین پر آگرتا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۳۴۔ جلد دوم، الرعد، حاشیہ ۲۔ الحجر، حواشی ۸ و ۱۲۔ جلد سوم، المؤمنون، حاشیہ ۱۵۔ جلد چہارم، لقمان، حاشیہ ۱۳۔ یٰس، حاشیہ ۳۷۔ الصافات، حواشی ۵-۶۔ المومن، حاشیہ ۹۰۔ جلد پنجم، قٓ، حواشی ۷-۸)۔

۱۰؎ مُراد ہے سُورج۔ اصل میں لفظ وَھَّاج استعمال ہوا ہے جس کے معنی نہایت گرم کے بھی ہیں اور نہایت روشن کے بھی، اس لیے ترجمہ میں ہم نے دونوں معنی درج کر دیئے ہیں۔ اِس مختصر سے فقرے میں اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت کے جس عظیم الشان نشان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اُس کا قطر زمین کے قُطر سے ۱۰۹ گنا اور اس کا حجم زمین کے حجم سے ۳ لاکھ ۳۳ ہزار گنا زیادہ بڑا ہے۔ اس کا درجۂ حرارت ایک کروڑ چالیس لاکھ ڈگری سنٹی گریڈ ہے۔ زمین سے ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل دُور ہونے کے باوجود اُس کی روشنی کا یہ حال ہے کہ انسان اگر برہنہ آنکھ سے اس کی طرف نظر جمانے کی کوشش کرے تو اپنی بینائی کھو بیٹھے، اور اس کی گرمی کا حال یہ ہے کہ زمین کے بعض حصّوں میں اس کی تپش کی وجہ سے درجۂ حرارت ۱۴۰ ڈگری فارن ہائٹ تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ اللہ ہی کی حکمت ہے کہ اس نے زمین کو اُس سے ٹھیک ایسے فاصلے پر رکھا ہے کہ نہ اُس سے بہت قریب ہونے کے باعث یہ بے انتہا گرم ہے اور نہ بہت دُور ہونے کے باعث بے انتہا سرد، اِسی وجہ سے یہاں انسان، حیوان اور نباتات کی زندگی ممکن ہوتی ہے۔ اُسی سے قوت کے بے حساب خزانے نکل کر زمین پر پہنچ رہے ہیں جو ہمارے لیے سببِ حیات بنے ہوتے ہیں۔ اُسی سے ہماری فصلیں پک رہی ہیں اور ہر مخلوق کو غذا بہم پہنچ رہی ہے۔ اُسی کی حرارت سمندروں کے پانی کو گرم کر کے وہ بھاپیں اُٹھاتی ہے جو ہواؤں کے ذریعہ سے زمین کے مختلف حصّوں پر پھیلتی اور بارش کی شکل میں برستی ہیں۔ اِس سورج میں اللہ نے ایسی زبردست بھٹی سُلگا رکھی ہے جو اربوں سال سے روشنی، حرارت اور مختلف اقسام کی شعاعیں سارے نظامِ شمسی میں پھینکتے چلی جا رہی ہے۔

بے شک فیصلے کا دن ایک مقرّر وقت ہے جس روز صور میں پھونک مار دی جائے گی، تم فوج در فوج نکل آؤ گے[۱۲] اور آسمان کھول دیا جائے گا حتیٰ کہ وہ دروازے ہی دروازے بن کر رہ جائے گا اور پہاڑ چلائے جائیں گے یہاں تک کہ وہ سراب ہو جائیں گے[۱۳]

[۱۱] زمین پر بارش کے انتظام اور نباتات کی روئیدگی میں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور حکمت کے جو حیرت انگیز کمالات کارفرما ہیں ان پر تفصیل کے ساتھ تفہیم القرآن کے حسبِ ذیل مقامات پر روشنی ڈالی گئی ہے: جلد دوم، النحل حاشیہ ۵۳ الف۔ جلد سوم، المومنون، حاشیہ ۱۷۔ الشعراء، حاشیہ ۵۔ الروم، حاشیہ ۳۵۔ جلد چہارم، فاطر، حاشیہ ۱۹۔ یٰس، حاشیہ ۲۹۔ المومن، حاشیہ ۲۰۔ الزُّخرف، حواشی ۱۰-۱۱۔ جلد پنجم، الواقعہ، حواشی ۲۸ تا ۳۰۔

اِن آیات میں پے در پے بہت سے آثار و شواہد کو پیش کر کے قیامت اور آخرت کے منکرین کو یہ بتایا گیا ہے کہ اگر تم آنکھیں کھول کر زمین اور پہاڑوں اور خود اپنی پیدائش اور اپنی نیند اور بیداری اور روز و شب کے اِس انتظام کو دیکھو، کائنات کے بندھے ہوئے نظام اور آسمان کے چمکتے ہوئے سُورج کو دیکھو، بادلوں سے برسنے والی بارش اور اس سے پیدا ہونے والی نباتات کو دیکھو، تو تمھیں دو باتیں ان میں نمایاں نظر آئیں گی۔ ایک یہ کہ یہ سب کچھ ایک زبردست قدرت کے بغیر نہ وجود میں آسکتا ہے، نہ اِس باقاعدگی کے ساتھ جاری رہ سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ان میں سے ہر چیز کے اندر ایک عظیم حکمت کام کر رہی ہے اور کوئی کام بھی بے مقصد نہیں ہو رہا ہے۔ اب یہ بات صرف ایک نادان ہی کہہ سکتا ہے کہ جو قدرت اِن ساری چیزوں کو وجود میں لانے پر قادر ہے وہ انھیں فنا کر دینے اور دوبارہ کسی اور صورت میں پیدا کر دینے پر قادر نہیں ہے۔ اور یہ بات بھی صرف ایک بے عقل ہی کہہ سکتا ہے کہ جس حکیم نے اس کائنات میں کوئی کام بھی بے مقصد نہیں کیا ہے اس نے اپنی دنیا میں انسان کو سمجھ بوجھ، خیر و شر کی تمیز، طاعت و عصیان کی آزادی، اور اپنی بے شمار مخلوقات پر تصرف کے اختیارات بے مقصد ہی دے ڈالے ہیں، انسان اس کی دی ہوئی اِن چیزوں کو اچھی طرح استعمال کرے یا بری طرح، دونوں صورتوں میں اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلنا، کوئی بھلائیاں کرتے کرتے مر جائے تو بھی مٹی میں مل کر ختم ہو جائے گا اور بُرائیاں کرتے کرتے مر جائے تو بھی مٹی ہی میں مل کر ختم ہو جائے گا، نہ بھلے کو اس کی بھلائی کا کوئی اجر ملے گا، نہ بُرے سے اس کی بُرائی پر کوئی باز پرس ہوگی۔ زندگی بعد موت اور قیامت و آخرت پر یہی دلائل ہیں جو جگہ جگہ قرآن مجید میں بیان کیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر حسب ذیل

درحقیقت جہنم ایک گھات ہے[۲۴]، سرکشوں کا ٹھکانا جس میں وہ مدتوں پڑے رہیں گے[۲۵]۔ اس کے اندر

مقامات ملاحظہ ہوں: تفہیم القرآن، جلد دوم، الرعد، حاشیہ ۷۔ جلد سوم، الحج، حاشیہ ۹۔ الروم، حاشیہ ۶۔ جلد چہارم، سبا، حواشی ۱۰ اور ۱۲۔ الصافات، حواشی ۸-۹۔

۲۲؎ اس سے مراد وہ آخری نفخ صور ہے جس کا آوازہ بلند ہوتے ہی تمام مرے ہوئے انسان یکایک جی اٹھیں گے، اور تم سے مراد صرف وہی لوگ نہیں ہیں جو اُس وقت مخاطب تھے، بلکہ وہ تمام انسان ہیں جو آغاز آفرینش سے قیامت تک پیدا ہوئے ہوں (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، ابراہیم، حاشیہ ۵۷۔ جلد سوم، الحج، حاشیہ ۱۔ جلد چہارم، یٰس، حواشی ۴۶-۴۷۔ الزُّمر، حاشیہ ۷۹)۔

۲۳؎ اِس مقام پر یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ یہاں بھی قرآن کے دوسرے بہت سے مقامات کی طرح قیامت کے مختلف مراحل کا ذکر ایک ساتھ کیا گیا ہے۔ پہلی آیت میں اُس کیفیت کا ذکر ہے جو آخری نفخِ صور کے وقت پیش آئے گی، اور بعد کی دو آیتوں میں وہ حالت بیان کی گئی ہے جو دوسرے نفخِ صور کے موقع پر رونما ہوگی۔ اس کی صراحت ہم تفہیم القرآن، جلد پنجم، تفسیر سورۃ الحاقہ، حاشیہ ۱۰ میں کرچکے ہیں۔ "آسمان کھول دیا جائے گا" سے مراد یہ ہے کہ عالمِ بالا میں کوئی بندش اور رکاوٹ باقی نہ رہے گی اور ہر طرف سے ہر آفتِ سماوی اس طرح ٹوٹی پڑ رہی ہوگی کہ معلوم ہوگا گویا اس کے آنے کے لیے سارے دروازے کھلے ہیں اور اس کو روکنے کے لیے کوئی دروازہ بھی بند نہیں رہا ہے۔ پہاڑوں کے چلنے اور سراب بن کر رہ جانے کا مطلب یہ ہے کہ دیکھتے دیکھتے پہاڑ اپنی جگہ سے اکھڑ کر اڑیں گے اور پھر ریزہ ریزہ ہوکر اس طرح پھیل جائیں گے کہ جہاں پہلے کبھی پہاڑ تھے وہاں ریت کے وسیع میدانوں کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔ اِسی کیفیت کو سورۂ طٰہٰ میں یوں بیان کیا گیا ہے: "یہ لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ آخر اُس دن یہ پہاڑ کہاں چلے جائیں گے؟ اِن سے کہو میرا رب ان کو دھول بنا کر اڑا دیگا اور زمین کو ایسا ہموار چٹیل میدان بنا دے گا کہ اس میں تم کوئی بل اور سلوٹ تک نہ دیکھو گے" (آیات ۱۰۵ تا ۱۰۷ مع حاشیہ ۸۳)۔

۲۴؎ گھات اُس جگہ کو کہتے ہیں جو شکار کو پھانسنے کے لیے بنائی جاتی ہے تاکہ وہ بے خبری کی حالت میں آئے اور اچانک اس میں پھنس جائے۔ جہنم کے لیے یہ لفظ اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ خدا کے باغی اُس سے بے خوف ہوکر دنیا میں یہ سمجھتے ہوئے اُچھل کود کرتے پھر رہے ہیں کہ خدا کی خدائی اُن کے لیے ایک کھلی آماجگاہ ہے، اور یہاں کسی پکڑ کا

خطرہ نہیں ہے، لیکن جہنم اُن کے لیے ایک ایسی چھپی ہوئی گھات ہے جس میں وہ یکایک پھنسیں گے اور بس پھنس کر ہی رہ جائیں گے۔

۵۱ اصل میں لفظ اَحقاب استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی ہیں پے در پے آنے والے طویل زمانے، ایسے مسلسل اَدوار کہ ایک دَور ختم ہوتے ہی دوسرا دَور شروع ہو جائے۔ اس لفظ سے بعض لوگوں نے یہ استدلال کرنے کی کوشش کی ہے کہ جنت کی زندگی میں تو ہمیشگی ہوگی مگر جہنم میں ہمیشگی نہیں ہوگی، کیونکہ یہ مدتیں خواہ کتنی ہی طویل ہوں، بہرحال جب مدتوں کا لفظ استعمال کیا گیا ہے تو اس سے یہی متصور ہوتا ہے کہ وہ لامتناہی نہ ہوں گی بلکہ کبھی نہ کبھی جا کر ختم ہو جائیں گی۔ لیکن یہ استدلال دو وجوہ سے غلط ہے۔ ایک یہ کہ عربی لغت کے لحاظ سے حُقب کے لفظ ہی میں یہ مفہوم شامل ہے کہ ایک حقب کے پیچھے دوسرا حقب ہو، اس لیے احقاب لازماً ایسے اَدوار ہی کے لیے بولا جائے گا جو پے در پے ایک دوسرے کے بعد آتے چلے جائیں اور کوئی دَور بھی ایسا نہ ہو جس کے پیچھے دوسرا دَور نہ آئے۔ دوسرے یہ کہ کسی موضوع کے متعلق قرآنِ مجید کی کسی آیت سے کوئی ایسا مفہوم لینا اصولاً غلط ہے جو اُسی موضوع کے بارے میں قرآن کے دوسرے بیانات سے متصادم ہوتا ہو۔ قرآن میں ۳۴ مقامات پر اہلِ جہنم کے لیے خلود (ہمیشگی) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، تین جگہ صرف لفظ خلود ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس پر ابداً (ہمیشہ ہمیشہ) کا بھی اضافہ کر دیا گیا ہے، اور ایک جگہ صاف صاف ارشاد ہوا ہے کہ "وہ چاہیں گے کہ جہنم سے نکل جائیں، مگر وہ اس سے ہرگز نکلنے والے نہیں ہیں اور ان کے لیے قائم رہنے والا عذاب ہے" (المائدہ آیت ۳۷)۔ ایک دوسری جگہ فرمایا گیا ہے کہ "اسی حالت میں وہ ہمیشہ رہیں گے جب تک کہ زمین و آسمان قائم ہیں اِلّا یہ کہ تیرا رب کچھ اور چاہے"۔ اور یہی بات اہلِ جنت کے متعلق بھی فرمائی گئی ہے کہ "جنت میں وہ ہمیشہ رہیں گے جب تک زمین و آسمان قائم ہیں اِلّا یہ کہ تیرا رب کچھ اور چاہے" (ہود، آیات ۱۰۷-۱۰۸)۔ اِن تصریحات کے بعد لفظ اَحقاب کی بنیاد پر یہ کہنے کی آخر کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ جہنم میں خدا کے باغیوں کا قیام دائمی نہیں ہوگا بلکہ کبھی نہ کبھی ختم ہو جائے گا؟

کسی ٹھنڈک اور پینے کے قابل کسی چیز کا مزہ وہ نہ چکھیں گے، کچھ ملے گا تو بس گرم پانی اور زخموں کا دھوون،[۱۵]
(اُن کے کرتوتوں) کا بھرپور بدلہ۔ وہ کسی حساب کی توقع نہ رکھتے تھے اور ہماری آیات کو انہوں نے
بالکل جھٹلا دیا تھا،[۱۶] اور حال یہ تھا کہ ہم نے ہر چیز گِن گِن کر لکھ رکھی تھی[۱۷]۔ اب چکھو مزہ، ہم تمہارے
لیے عذاب کے سوا کسی چیز میں ہرگز اضافہ نہ کریں گے ؏

یقیناً متقیوں[۱۸] کے لیے کامرانی کا ایک مقام ہے، باغ اور انگور، اور نوخیز ہم سن لڑکیاں[۱۹]، اور

۱۵؎ اصل میں لفظ غَسّاق استعمال ہوا ہے جس کا اطلاق پیپ، لہو، کچ لہو، اور آنکھوں اور کھالوں سے بہنے والی ان تمام رطوبتوں پر ہوتا ہے جو شدید تعذیب کی وجہ سے نکلتی ہوں۔ اس کے علاوہ یہ لفظ ایسی چیز کے لیے بھی بولا جاتا ہے جس میں سخت تعفّن اور سڑاند ہو۔

۱۶؎ یہ ہے وہ سبب جس کی بنا پر وہ جہنم کے اس خوفناک عذاب کے مستحق ہوں گے۔ ایک یہ کہ دنیا میں وہ یہ سمجھتے ہوئے زندگی بسر کرتے رہے کہ کبھی وہ وقت نہیں آنا ہے جب انہیں خدا کے سامنے حاضر ہو کر اپنے اعمال کا حساب دینا ہو۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کے ذریعہ سے ان کی ہدایت کے لیے جو آیات بھیجی تھیں انہیں ماننے سے انہوں نے قطعی انکار کر دیا اور ان کو جھوٹ قرار دیا۔

۱۷؎ یعنی اُن کے اقوال و افعال کا، ان کی حرکات و سکنات کا، حتیٰ کہ ان کی نیتوں اور خیالات اور مقاصد تک کا مکمل ریکارڈ ہم تیار کرتے جا رہے تھے جس سے کوئی چیز چھوٹی ہوئی نہ تھی، اور وہ بے وقوف اس سے بے خبر اپنی جگہ یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ وہ کسی اندھیر نگری میں جی رہے ہیں جہاں وہ اپنی مرضی اور خواہش سے جو کچھ چاہیں کرتے رہیں، اس کی باز پرس کرنے والا کوئی نہیں ہے۔

۱۸؎ یہاں متقیوں کا لفظ اُن لوگوں کے مقابلے میں استعمال کیا گیا ہے جو کسی حساب کی توقع نہ رکھتے تھے اور جنہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلا دیا تھا۔ اس لیے لامحالہ اس لفظ سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ کی آیات کو مانا اور دنیا میں یہ سمجھتے ہوئے زندگی بسر کی کہ انہیں اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔

۱۹؎ اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ وہ آپس میں ہم سن ہوں گی۔ اور یہ بھی کہ وہ ان لوگوں کی ہم سن ہوں گی جن کی زوجیت میں وہ دی جائیں گی۔ سورۂ ص، آیت ۵۲، اور سورۂ واقعہ آیت ۳۷ میں بھی یہ مضمون گزر

چھلکتے ہوئے جام۔ وہاں کوئی لغو اور جھوٹی بات وہ نہ سُنیں گے[۲۱]۔ جزاء اور کافی انعام[۲۲] تمہارے رب کی طرف سے، اُس نہایت مہربان خدا کی طرف سے جو زمین اور آسمانوں کا اور ان کے درمیان کی ہر چیز کا مالک ہے، جس کے سامنے کسی کو بولنے کا یارا نہیں[۲۳]۔

جس روز روح[۲۴] اور ملائکہ صف بستہ کھڑے ہوں گے، کوئی نہ بولے گا سوائے اُس کے جسے رحمان اجازت دے اور جو ٹھیک بات کہے[۲۵]۔ وہ دن برحق ہے، اب جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف

چکلہے۔

۲۱؎ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اس بات کو جنت کی بڑی نعمتوں میں شمار کیا گیا ہے کہ آدمی کے کان وہاں بیہودہ اور جھوٹی اور گندی باتیں سننے سے محفوظ رہیں گے۔ وہاں کوئی یاوہ گوئی اور فضول گپ بازی نہ ہوگی، کوئی کسی سے نہ جھوٹ بولے گا نہ کسی کو جھٹلائے گا۔ دُنیا میں گالم گلوچ، بُہتان، اِفترا، تُہمت اور الزام تراشیوں کا جو طوفان برپا ہے، اس کا کوئی نام و نشان وہاں نہ ہوگا (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد سوم، مریم، حاشیہ ۳۸۔ جلد پنجم، الواقعہ، حواشی ۱۳-۱۴)۔

۲۲؎ جزاء کے بعد کافی انعام دینے کا ذکر یہ معنی رکھتا ہے کہ اُن کو صرف وہی جزا نہیں دی جائے گی جس کے وہ اپنے نیک اعمال کی بنا پر مستحق ہوں گے، بلکہ اس پر مزید انعام اور کافی انعام بھی انہیں دیا جائے گا۔ اس کے برعکس اہلِ جہنم کے بارے میں صرف اتنا فرمایا گیا ہے کہ انہیں ان کے کرتوتوں کا بھرپور بدلہ دے دیا جائے گا، یعنی نہ ان کے جرائم سے کم سزا دی جائے گی، نہ اس سے زیادہ۔ یہ بات قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر وضاحت کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ مثلاً یُونس، آیات ۲۶-۲۷۔ النمل، آیات ۸۹-۹۰۔ القصص، آیت ۸۴۔ سبا، آیات ۳۳ تا ۳۸۔ المومن، آیت ۴۰۔

۲۳؎ یعنی میدانِ حشر میں دربارِ الٰہی کے رُعب کا یہ عالم ہوگا کہ اہلِ زمین ہوں یا اہلِ آسمان، کسی کی بھی یہ مجال نہ ہوگی کہ از خود اللہ تعالیٰ کے حضور زبان کھول سکے، یا عدالت کے کام میں مداخلت کر سکے۔

۲۴؎ اہلِ تفسیر کی اکثریت کا خیال یہی ہے کہ اس سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں اور ان کا جو بلند مرتبہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہے اس کی وجہ سے ملائکہ سے الگ ان کا ذکر کیا گیا ہے (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن،

پلٹنے کا راستہ اختیار کرلے۔

ہم نے تم لوگوں کو اُس عذاب سے ڈرا دیا ہے جو قریب آلگا ہے[۲۶] جس روز آدمی وہ سب کچھ دیکھ لے گا جو اس کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے، اور کافر پکار اُٹھے گا کہ کاش میں خاک ہوتا[۲۷]۔ ع

جلد پنجم، المعارج، حاشیہ ۳)۔

۲۵ بولنے سے مراد شفاعت ہے، اور فرمایا گیا ہے کہ وہ صرف دو شرطوں کے ساتھ ممکن ہوگی۔ ایک شرط یہ کہ جس شخص کو جس گنہگار کے حق میں شفاعت کی اجازت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملے گی صرف وہی شخص اُسی کے حق میں شفاعت کرسکے گا۔ دوسری شرط یہ کہ شفاعت کرنے والا بجا اور درست بات کہے، بے جا نوعیت کی سفارش نہ کرے، اور جس کے معاملہ میں وہ سفارش کر رہا ہو وہ دنیا میں کم از کم کلمۂ حق کا قائل رہا ہو، یعنی محض گناہ گار ہو، کافر نہ ہو۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۲۸۱۔ جلد دوم، یونس، حاشیہ ۵۔ ہود، حاشیہ ۱۰۶۔ جلد سوم، مریم، حاشیہ ۵۲۔ طٰہٰ، حواشی ۸۵-۸۶۔ الانبیاء، حاشیہ ۲۷۔ جلد چہارم، سبا، حواشی ۴۰-۴۱۔ المومن، حاشیہ ۳۲۔ الزخرف، حاشیہ ۶۸۔ جلد پنجم، النجم، حاشیہ ۲۱)۔

۲۶ بظاہر ایک آدمی یہ خیال کرسکتا ہے کہ جن لوگوں کو خطاب کرکے یہ بات کہی گئی تھی ان کو مرے ہوئے اب ۱۴ سو سال گزر چکے ہیں، اور اب بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ قیامت آئندہ کتنے سو، یا کتنے ہزار، یا کتنے لاکھ برس بعد آئیگی۔ پھر یہ بات کس معنی میں کہی گئی ہے کہ جس عذاب سے ڈرایا گیا ہے وہ قریب آلگا ہے؟ اور سورۃ کے آغاز میں یہ کیسے کہا گیا ہے کہ عنقریب انہیں معلوم ہوجائے گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انسان کو وقت کا احساس صرف اُسی وقت تک رہتا ہے جب تک وہ اِس دنیا میں زمان و مکان کی حدود کے اندر جسمانی طور پر زندگی بسر کر رہا ہے۔ مرنے کے بعد جب صرف روح باقی رہ جائے گی، وقت کا احساس و شعور باقی نہ رہے گا، اور قیامت کے روز جب انسان دوبارہ زندہ ہوکر اُٹھے گا اس وقت اسے یُوں محسوس ہوگا کہ ابھی سوتے سوتے اسے کسی نے جگا دیا ہے۔ اس کو یہ احساس بالکل نہیں ہوگا کہ وہ ہزارہا سال کے بعد دوبارہ زندہ ہوا ہے (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، النحل، حاشیہ ۲۶۔ بنی اسرائیل، حاشیہ ۵۶۔ جلد سوم، طٰہٰ، حاشیہ ۸۰۔ جلد چہارم، یٰس، حاشیہ ۴۸)۔

۲۷ یعنی دنیا میں پیدا ہی نہ ہوتا، یا مرکر مٹی میں مل جاتا اور دوبارہ زندہ ہوکر اُٹھنے کی نوبت نہ آتی۔

فقر و فاقہ اور اُس کا اسلامی حل !

(۹)

یوسف القرضاوی

ترجمہ: عبدالحمید صدیقی

مستحقین زکوٰۃ کون کون ہیں | قرآنِ مجید میں زکوٰۃ کی آمدنی کے ذرائع کی نسبت اس کے مصارف کو زیادہ قابلِ اعتناء سمجھا گیا ہے۔ کیونکہ مختلف وسائل سے اموال کا جمع کرنا اصحابِ اقتدار کے لیے آسان ہوتا ہے۔ مگر در حقیقت جو بات مشکل ہوتی ہے وہ یہ کہ اُن کو صحیح مصارف میں صرف کیا جائے اور انہی لوگوں پر خرچ کیا جائے جو فی الحقیقت ان کے مستحق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ مجید نے زکوٰۃ کے مصارف کے تعین کو کسی حاکم کی رائے اور خواہش پر نہیں چھوڑا ہے، نہ کسی لالچی کے لالچ پر چھوڑا ہے جو یہ چاہتا ہو کہ باطل طریقے سے زکوٰۃ کے مستحقین کو اس سے محروم کر دے۔ قرآن مجید نے یہ سب کچھ واضح کر دیا ہے کہ کن کن اشخاص اور کون کونسی جگہوں پر زکوٰۃ صرف کی جا سکتی ہے اور ان منافقین کو صاف صاف جواب دیا ہے، جن کی رال زکوٰۃ کا مال دیکھ دیکھ کر ٹپکی پڑتی تھی اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو طعنہ دیتے تھے کہ آپ نے انہیں نظر انداز کر دیا ہے اور اُن کی گوناگوں خواہشات کو پورا نہیں کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمِنْهُمْ مَنْ يَلْمِزُكَ فِي الصَّدَقَاتِ فَإِنْ أُعْطُوا مِنْهَا رَضُوا وَإِنْ لَمْ يُعْطَوْا مِنْهَا إِذَا هُمْ يَسْخَطُونَ ۔ (التوبہ - ۵۸)

اور بعض اُن میں سے وہ ہیں جو الزام دھرتے ہیں آپ پر صدقات کے معاملہ میں۔ اگر اُن کو بھی دیا جائے اس میں سے تو خوش ہو جاتے ہیں، اور اگر نہ دیا جائے ان کو اس میں سے تو اُسی وقت ناراض ہو جاتے ہیں۔

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَ

صدقات تو بس فقیروں اور مسکینوں اور عاملین کے

الْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيلِ، فَرِيضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ۔ (توبہ - ۶۰)	لیے ہیں جو ان صدقات پر مقرر ہیں اور اُن کے لیے ہیں جن کے دلوں میں اُلفت ڈالنی ہے اور گردنوں کے چھڑانے اور قرضداروں کے قرضہ اور اللہ کی راہ میں اور مسافر کے زادِ راہ میں (خرچ ہونے چاہییں) فرض ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

سُننِ ابی داؤد کی روایت ہے کہ ایک آدمی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا مجھے صدقات میں سے کچھ دیجیے۔ آپؐ نے اس سے فرمایا "بے شک اللہ تعالیٰ نے صدقے کے بارے میں کسی نبی یا کسی اور کا کوئی حکم اپنے کو پسند نہیں کیا بلکہ وہ خود اس کے بارے میں حاکمانہ اختیارات رکھتا ہے۔ چنانچہ اُس نے صدقات کے مصارف کو آٹھ حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ اگر تم بھی ان حصّوں میں سے ہوتے تو میں تمہارا حق دے دیتا"۔

زکوٰۃ و صدقات کے ان ہشت گانہ مصارف میں سے ہمارا موضوعِ بحث فقراء و مساکین ہیں۔ یہ دونوں ان مصارف میں سے پہلا مصرف ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کا مستحق قرار دیا ہے۔ فقیر اور مسکین کے معنی و مفہوم اور ان کے باہمی فرق کو متعین کرنے میں اور اس بات میں کہ ان دونوں میں سے کون زیادہ بدحال ہے، فقہاء و مفسّرین میں اختلاف پایا جاتا ہے لیکن یہ اختلاف زکوٰۃ کے باب میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا، کیونکہ اس بات پر سب علمائے اُمّت متفق ہیں کہ یہ دونوں (فقیر اور مسکین) ایک ہی گروہ کی دو قسمیں ہیں اور وہ ہے اہلِ ضرورت اور صاحبِ احتیاج افراد کا گروہ۔ تاہم فقیر اُس محتاج کو کہتے ہیں جو لوگوں سے سوال نہیں کرتا اور مسکین وہ ہے جو لوگوں کے پاس جا جا کر اُن سے کچھ مانگتا ہے۔ اور جمہور فقہاء کی رائے یہ ہے کہ فقیر مسکین کی نسبت زیادہ بدحال ہوتا ہے۔ بعض فقہاء نے فقیر اور مسکین کی حدبندی یوں کی ہے کہ فقیر وہ ہے جس کے پاس کچھ نہ ہو یا اگر ہو تو وہ اس کی اپنی اور اس کے کنبہ کی ضرورت سے آدھا ہو اور مسکین وہ ہے جس کے پاس اپنی ضرورت سے آدھا یا اس سے کچھ زیادہ ہو مگر اتنا نہ ہو کہ اس کی

ضرورت کو پورا کر سکے۔

خود دار اور چھپے محتاج زکوٰۃ کے زیادہ حقدار ہیں اسلامی تعلیمات کے غلط طور پر پیش کیے جانے اور اُن کی غلط تعبیر و تطبیق کی وجہ سے ہو سکتا ہے اکثر لوگوں کا یہ خیال ہو کہ فقراء و مساکین جو زکوٰۃ کے مستحق ہیں وہ یہ بیکار رہنے والے اور بھیک مانگنے والے ہیں جنہوں نے بھیک مانگنے کو پیشے کے طور پر اختیار کر رکھا ہے اور بظاہر فقر و مسکنت کا روپ دھارے ہوئے ہیں۔ مسجدوں کے دروازوں پر، بازاروں میں اور اُن جگہوں پر جہاں لوگ جمع ہوں، سب آنے جانے والوں کے آگے ہاتھ پھیلاتے پھرتے ہیں۔ غالباً مسکین کی یہ تصویر اکثر لوگوں کے ذہنوں میں زمانہ قدیم سے چلی آ رہی ہے حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی لوگ فقراء و مساکین سے مراد ایسے ہی لوگ لیا کرتے تھے۔ چنانچہ آپؐ لوگوں کو بتاتے رہتے تھے کہ فلاں فلاں افراد حقیقی طور پر ضرورتمند ہیں جو بجا طور پر معاشرے سے اعانت کا استحقاق رکھتے ہیں اگرچہ اکثر لوگ انہیں پہچانتے نہیں ہوتے تھے۔ حضور علیہ السلام کا ارشادِ گرامی ہے کہ مسکین وہ نہیں جسے ایک کھجور یا دو کھجوریں اور ایک لقمہ یا دو لقمے دے دیئے جائیں تو وہ چلتا بنے بلکہ مسکین تو وہ ہے جو خود دار ہو اور تم چاہو تو کہہ لو، کہ لوگوں کے پیچھے پڑ کر نہ مانگتا ہو۔

یہ وصف اُن مہاجرین فقراء کا تھا جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ہو کر رہ گئے تھے اور اُن کے پاس نہ تو اتنا مال تھا اور نہ کوئی کاروبار کہ اُن کی ضرورتیں پوری ہوں اور وہ دوسروں کے محتاج نہ رہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کا یہ وصف اور شان بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِى الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ، تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمَاهُمْ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا۔

(البقرہ: ۲۷۳)

خاص طور پر صدقات کے مستحق وہ تنگ دست لوگ ہیں جو اللہ کے کام میں ایسے گھر گئے ہیں کہ اپنی ذاتی کسبِ معاش کے لیے زمین میں کوئی دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے۔ اُن کی خودداری کو دیکھ کر ناواقف آدمی گمان کرتا ہے کہ یہ خوش حال ہیں۔ تم اُن کے چہروں سے اُن کی اندرونی حالت پہچان سکتے ہو۔ مگر وہ ایسے لوگ نہیں ہیں کہ لوگوں کے پیچھے پڑ کر کچھ مانگیں۔

مذکورۂ بالا احادیث میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ہدایت فرمائی ہے اس کے مطابق مدد و اعانت کے یہ لوگ زیادہ حقدار ہیں جن کا آیتِ محوّلہ بالا میں ذکر ہے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ "مسکین وہ نہیں جو لوگوں کے اردگرد گھومتا پھرے اور ایک لقمہ یا دو لقمے یا ایک کھجور یا دو کھجوریں اُسے لوٹا دیں، بلکہ مسکین وہ ہے جو اپنی حاجت بھر مال نہیں پاتا اور نہ پہچانا جاتا ہے کہ اس کی مدد کی جائے اور نہ کھڑا ہو کر لوگوں سے مانگتا ہے"۔ یہی وہ مسکین ہے جو باوجود اس کے کہ لوگ اُسے در خورِ اعتنا نہ سمجھتے ہوں اور اسے پہچانتے بھی نہ ہوں، مدد و اعانت کا مستحق ہے۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کی توجہ اُن کی طرف مبذول کرائی ہے۔ ان میں اکثریت اُن لوگوں کی ہے جو گھر والے ہیں، خوددار گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں، مگر اُن پر تنگی کا وقت آگیا ہے یا عاجزی و درماندگی انہیں لے بیٹھی ہے یا ان کے مال میں قلت اور عیال میں کثرت ہو گئی ہے یا کام کاج اور محنت مزدوری سے انہیں اتنی آمدنی نہیں ہوتی کہ اُن کی جائز ضروریات کو پورا کر سکے۔

امام حسن بصریؒ سے اُس شخص کے بارے میں پوچھا گیا جس کا مکان بھی ہو اور ایک خادم بھی کہ کیا وہ زکوٰۃ لے لے؟ آپ نے جواب دیا کہ ہاں اگر وہ ضرورت مند ہو تو لے لے۔ کوئی حرج نہیں[1]۔

امام احمد بن حنبل سے ایک شخص کے متعلق پوچھا گیا کہ اگر اس کی کوئی غیر منقولہ ملکیت ہو جس سے اُسے آمدنی ہوتی ہو یا دس ہزار درہم یا اس سے کم و بیش کی کوئی جائداد ہو مگر اس کی آمدنی سے اُس کی ضروریات پوری نہ ہوتی ہوں تو کیا وہ زکوٰۃ لے لے؟ آپ نے فرمایا: "وہ زکوٰۃ میں سے کچھ رقم لے سکتا ہے[2]"۔

شوافع کا کہنا ہے کہ اگر کسی آدمی کے پاس کوئی غیر منقولہ جائیداد ہو مگر اس کی آمدنی اس کی ضرورت سے کم رہ جاتی ہو تو وہ فقراء و مساکین کے زمرے میں آئے گا اور اُسے زکوٰۃ میں سے اتنا مال دیا جائے گا کہ اُس کی ضرورت پوری ہو جائے اور وہ اس بات کا مکلف نہیں کہ اپنی جائیداد بیچ دے[3]۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی آدمی کے پاس زکوٰۃ کے نصاب یا اس سے زیادہ دولت ہو اور موزوں و مناسب گھر اور خادم بھی ہو تو کثرتِ عیال کی وجہ سے اُسے زکوٰۃ دینا جائز ہے[4]"۔

---

[1] الاموال لابی عبید ص ۵۵۶۔ [2] المغنی مع الشرح الکبیر ج ۲، ص: ۵۲۵۔

[3] المجموع: ج ۶ ص ۱۹۲ [4] شرح الخرشی اور حاشیہ العدوی علی خلیل، ج ۲ ص ۲۸۰۔

احناف اس بات کے قائل ہیں کہ اگر ایسے آدمی کو زکوٰۃ دے دی جائے جس کے پاس رہنے کے لیے جگہ ہو، گھر میں ضرورت کی ہر چیز، خادم، گھوڑا، اسلحہ، تن کے کپڑے وغیرہ موجود ہوں، اور اگر وہ اہل علم میں سے ہو تو کتابیں بھی موجود ہوں، پھر بھی اس کو زکوٰۃ دینے میں کوئی مضایقہ نہیں۔ وہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی اس روایت سے استدلال کرتے ہیں جس میں انہوں نے فرمایا ہے کہ "جو آدمی گھوڑا، ہتھیار، خادم اور مکان کی شکل میں دس ہزار درہموں کا مالک ہوتا تھا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اُسے بھی زکوٰۃ دے دیا کرتے تھے"۔ اس لیے کہ یہ چیزیں تو انسان کی وہ لازمی ضروریات ہیں جن کے بغیر چارہ نہیں۔ لہٰذا زکوٰۃ کے استحقاق کے معاملے میں ان کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔[1]

معلوم ہوا کہ زکوٰۃ صرف اُس نادار اور محتاج کے لیے نہیں ہے جس کے پاس کچھ نہ ہو یا وہ کسی شے کا مالک نہ ہو بلکہ اُس شخص کو بھی دی جاسکتی ہے جس کے پاس اتنا مال ہو کہ کسی حد تک اُس کی ضرورت پوری ہو سکے مگر اتنا نہ ہو کہ اُس سے اس کی تمام ضرورتیں پوری ہو جائیں۔

کمانے پر قدرت رکھنے والے کے لیے زکوٰۃ میں کوئی حصہ نہیں

جب زکوٰۃ و صدقات کے استحقاق کا دارومدار ضرورت — فرد کی اپنی اور اس کے کنبے کی ضروریاتِ زندگی — پر ہے تو پھر کیا اگر کوئی بیکار آدمی سوسائٹی پر بوجھ بن کر صدقات و خیرات کے سہارے زندگی بسر کر رہا ہو درآنحالیکہ وہ تندرست و توانا ہو اور کمانے پر قدرت رکھتا ہو اور کوئی کام یا کاروبار کر کے اپنے آپ کو دوسروں کی مدد سے بے نیاز کر سکتا ہو، تو اُسے زکوٰۃ دی جائے گی؟ بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ زکوٰۃ بیکاری کی ترغیب دینے والی اور کسل مند اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنے والی ہے۔ مگر اسلام کے اصول کچھ اور فیصلہ دیتے ہیں۔ کام کرنے کی قدرت رکھنے والے ہر شخص پر یہ فرض ہے کہ وہ کام کرے، اپنے کام میں ترقی کے لیے ہاتھ پاؤں مارے، اور اپنے ہاتھ کی محنت اور پیشانی کے پسینے سے روزی کما کر اپنی ضروریات پوری کرے۔ صحیح حدیث میں وارد ہے کہ "کسی شخص نے اپنے ہاتھ سے کما کر کھانے سے بہتر کبھی کوئی کھانا نہیں کھایا"۔[2] یہی وجہ ہے

---

[1] بدائع الصنائع للکاسانی، ج ۲ صفحہ ۴۸۔

[2] بخاری اور الترغیب والترہیب از مُنذری۔

کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری وضاحت اور صراحت سے فرمایا ہے کہ "صدقہ وغیرہ کسی مالدار، طاقت ور اور سلیم الاعضاء شخص کے لیے جائز نہیں[1]"۔ جسمانی قدرت اور بدنی طاقت بالکل بے معنی ہے جب تک اُن سے کام لے کر رزق و روزی نہ کمائی جائے کیونکہ قوت بغیر کام کے ننگے کو کپڑا نہیں پہنا سکتی اور بھوکے کو کھانا نہیں کھلا سکتی۔ البتہ جیسا کہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں "اگر کسی محنت مزدوری کرنے والے کو کوئی کام نہ ملے تو اس کے لیے زکوٰۃ جائز ہے کیونکہ وہ عاجز ہے[2]"۔

اُوپر جو حدیث مذکور ہوئی ہے اس میں صرف طاقت ور اور سلیم الاعضاء کے الفاظ پر اکتفا کیا گیا ہے مگر ایک دوسری حدیث میں طاقت کے ساتھ اکتساب (محنت مزدوری کرنا) کا بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ عبید اللہ بن عدی بن خیار سے روایت ہے کہ دو آدمیوں نے انہیں بتایا کہ وہ صدقہ وغیرہ مانگنے کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے تو آپ نے انہیں دیکھا کہ وہ دونوں تندرست و توانا ہیں۔ آپ نے انہیں فرمایا: "اگر تم چاہو تو میں تمہیں زکوٰۃ دے دیتا ہوں۔ مگر یاد رکھو کہ مالدار، طاقت ور اور محنت مزدوری کر سکنے والے کے لیے زکوٰۃ میں کوئی حصہ نہیں"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں "اگر تم چاہو" کے الفاظ اس لیے استعمال فرمائے تھے کہ آپؐ ان کے اندرونی حالات سے واقف نہیں تھے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بظاہر تو قوی الجثہ اور طاقت ور ہوں مگر فی الواقع انہیں کوئی کام نہ ملتا ہو، یا ملتا ہو تو اُس سے اُن کی ضرورت کے مطابق آمدنی نہ ہوتی ہو۔

اس حدیث سے عُلماء نے استدلال کیا ہے کہ حاکمِ وقت یا صاحبِ مال شخص کو یہ چاہیے کہ وہ اُس زکوٰۃ لینے والے کو وعظ و نصیحت کریں جس کی حقیقتِ حال سے وہ ناواقف ہوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوۂ حسنہ پر عمل کرتے ہوئے اُسے بتائیں کہ مالدار اور محنت مزدوری کر سکنے والے کے لیے زکوٰۃ کا لینا جائز نہیں[3]۔ یہاں محنت مزدوری سے مراد یہ ہے کہ محنت مزدوری کر کے حسبِ ضرورت کمایا جا سکتا ہو۔ اگر کوئی شخص محنت مزدوری کرنے کے باوجود حسبِ کفایت نہیں کما سکتا تو وہ زکوٰۃ کا استحقاق رکھتا ہے۔ صرف کسی کام اور کسب سے

---

[1] ترمذی [2] المجموع، ج ۶، ص ۱۹۱۔

[3] نیل الاوطار، ج ۴، ص ۱۷۰۔

عاجز ہونا استحقاقِ زکوٰۃ کے لیے کوئی شرط نہیں ہے کہ زکوٰۃ صرف اپاہجوں، مریضوں اور کام کی طاقت نہ رکھنے والوں کے لیے ہی مخصوص ہو۔ بلکہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ تو فرماتے ہیں کہ کام کے قابل ہونے کے معاملہ میں قابلِ لحاظ بات یہ بھی ہے کہ آدمی کو کام اس کے شایانِ شان مل رہا ہو۔ ورنہ جو کام اس کے شایانِ شان نہ ہو وہ اگر مل بھی سکتا ہو تو وہ نہ ملنے کے مترادف ہے[1]۔ مثلاً ایک اچھے تعلیم یافتہ آدمی سے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ نہیں حمالی کا کام تو مل سکتا ہے، لہٰذا تم بے روزگار نہیں ہو اور زکوٰۃ میں تمہارا کوئی حق نہیں ہے۔ طاقت در اور صحیح الاعضاء پر زکوٰۃ حرام ہونے کی جو حدیث اوپر مذکور ہوئی ہے اس کا اطلاق دراصل اُس طاقت ور پر ہوتا ہے جو باوجود اس کے کہ اُسے شایانِ شان کام کے مواقع میسر ہوں، بیکاری کو ایک خوشگوار مشغلہ سمجھتا ہو۔

حاصلِ کلام | جو شخص کما کر کھانے کی طاقت رکھتا ہے، شریعت اس سے یہ چاہتی ہے کہ وہ کام کرے تاکہ خود کفیل ہو سکے۔ اور جو کسی ذاتی کمزوری مثلاً صغر سنی، نسوانیت، ضعیف العقلی، کبر سنی، آفت رسیدگی اور کسی بیماری کی بنا پر کام کرنے سے عاجز ہو، یا اگر کام کر سکتا ہو تو اپنے شایانِ شان کمائی کا کوئی حلال ذریعہ نہ پاتا ہو، یا اگر پاتا ہو تو اس سے آمدنی اتنی تھوڑی ہو کہ اس کو اور اس کے خاندان کو کفایت نہ کر سکے، یا کسی حد تک تو کفایت کر سکے مگر پوری طرح کفایت نہ کر سکے، اس کے لیے زکوٰۃ لینا جائز ہے۔ اللہ کے دین میں ایسے شخص پر زکوٰۃ لینا کوئی گناہ نہیں۔ یہ تو ہیں اسلام کی وہ روشن تعلیمات جن میں عدل و احسان یا عدل و رحمت دونوں موجود ہیں۔ رہا مادہ پرستوں کا یہ اصول کہ "جو کام نہیں کرتا وہ کھائے بھی نہیں"، تو یہ اصول غیر فطری، غیر اخلاقی اور غیر انسانی ہے۔ ان مادہ پرستوں سے تو جانور اور حیوانات بہتر ہیں جن کی بعض قسمیں ایسی ہیں کہ ان میں سے طاقت ور کمزور کو اٹھاتا ہے اور قدرت و طاقت رکھنے والا عاجز و درماندہ کی حفاظت و نگہداشت کرتا ہے۔ کیا انسان ان چوپایوں کے مرتبے کو بھی نہیں پہنچ سکتا؟

ہمہ وقتی عبادت گزار زکوٰۃ نہ لے | واقعی بہت خوب ہے جو اس ضمن میں فقہائے اسلام نے فرمایا ہے کہ اگر کام کرنے کی قدرت رکھنے والا شخص کسبِ حلال کی کوشش چھوڑ کر اپنے آپ کو عبادتِ الٰہی مثلاً صوم و صلوٰۃ وغیرہ کے لیے وقف کر دے تو اُسے زکوٰۃ نہ دی جائے، کیونکہ اُسے تو یہ حکم دیا گیا ہے

---

[1] المجموع: ج ۶ ص ۱۹۰۔

کہ وہ کام کرے اور تلاشِ معاش میں زمین کے اطراف و اکناف میں پھرے۔ اسلام میں ترکِ دنیا کی کوئی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی ہے، نہ عبادت اس لیے ہے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آدمی بس عبادت ہی کرتا رہے۔ کمانے کے لیے کام کرنا نفلی عبادات سے افضل ہے بشرطیکہ نیت نیک ہو اور حدود اللہ کی پابندی کی جائے۔

طالب علم زکوٰۃ لے لے | جب کوئی شخص نفع بخش علم کو حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دے ہمہ وقتی اور کسبِ رزق اور طلبِ علم ایک ساتھ مشکل ہو تو اُسے مالِ زکوٰۃ سے اتنا دے دیا جائے جو اُسے اپنی تعلیم مکمل کرنے میں مدد دے سکے اور جس سے اُس کی ذاتی اور تعلیمی ضرورتیں پوری ہو جائیں۔ طالب علم کو اس لیے بھی مالِ زکوٰۃ دینا چاہیے کہ وہ قوم کی طرف سے فرض کفایہ ادا کرتا ہے اور اس کے علم کا نفع اس کی اپنی ذات تک محدود نہیں رہتا بلکہ ساری قوم مسلم اُس سے نفع اندوز ہوتی ہے۔ لہٰذا ایسے شخص کا حق ہے کہ مالِ زکوٰۃ میں سے اُس کی مدد کی جائے۔ کیونکہ زکوٰۃ دو شخصوں میں سے ایک کے لیے ہوتی ہے۔ یا تو اُس شخص کے لیے جو مسلمانوں میں سے محتاج و تنگ دست ہو، یا پھر اس شخص کے لیے جس کی خدمات کی مسلمانوں کو ضرورت ہو۔ طالب علم میں یہ دونوں باتیں پائی جاتی ہیں۔

بعض فقہاء نے زکوٰۃ کے مستحق طالب علم کے لیے یہ شرط بھی لگائی ہے کہ وہ ذہین ہو اور اُس سے یہ اُمید کی جا سکتی ہو کہ وہ علم میں مہارت اور برتری حاصل کرے گا اور اُمتِ مسلمہ کو اُس سے فائدہ پہنچے گا۔ بصورتِ دیگر بسب ضرورت تعلیم حاصل کرنے کے بعد جب وہ کما کر کھانے پر قادر ہو جائے تو زکوٰۃ لینے کا مستحق نہیں ہوگا۔ اور یہ ہے بھی بالکل صحیح بات۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے زکوٰۃ اسی حالت میں صرف کرنی چاہیے جب طالب علم اُس کا اہل ہو۔ بلکہ جو طالب علم ایک اچھا محقق بن سکتا ہو تو اسے علمی تحقیقات کی ضرورتیں فراہم کرنے پر بھی زکوٰۃ صرف کی جا سکتی ہے۔

زکوٰۃ سے فقیر یا مسکین کو کس قدر دیا جائے | ضروری ہے کہ ہم یہاں اس اہم سوال کا جواب بھی دیں تاکہ ہماری آنکھوں کے سامنے اسلامی زکوٰۃ کی صحیح اور مکمل تصویر آ جائے اور ہمیں معلوم ہو جائے کہ فقر و تنگ دستی کا مقابلہ کرنے میں زکوٰۃ کیا مؤثر کردار ادا کرتی ہے۔ اس سوال کے جواب کو اہمیت دینے کی وجہ یہ ہے کہ عامۃ الناس، قطع نظر اس سے کہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم، اِس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ فقیر زکوٰۃ میں سے چند

درہم، چند پیتیں اناج یا چند روٹیاں لیتا ہے اور اپنے لیے سدِ رمق کا سامان کر لیتا ہے۔ یا اُن سے چند دن، ایک مہینہ یا دو مہینے اپنی ضرورت پُوری کرتا ہے، اس کے بعد پھر وہ فاقہ مست اور تہی دست رہتا ہے اور ہمیشہ مدد کے لیے ہاتھ پھیلاتا رہتا ہے۔ یُوں زکوٰۃ اُن مسکّن گولیوں کے مشابہ ہو جاتی ہے جو ایک محدود عرصہ تک مریض کو آرام پہنچاتی ہیں، نہ کہ اُن تیر بہدف ادویہ کے مشابہ جو تکالیف اور امراض کو بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکتی ہیں۔

ہم اس سلسلے میں احکامِ اسلام اور فقہاء کے مذاہب کا مطالعہ کرنے کے بعد واضح کریں گے کہ زکوٰۃ کے بارے میں مذکورہ بالا خیال جو لوگوں کے ذہنوں پر چھایا ہوا ہے اس کی حیثیت شریعتِ اسلامی کی رُو سے ایک بے بنیاد وہم کے سوا کچھ بھی نہیں۔

پہلا مذہب اس سلسلے میں فقہاء کے مختلف مذاہب میں سے اسلام کے احکام و نصوص سے قریب تر یہ مذہب ہے کہ فقیر کو اتنا دو جو اس کے فقر و فاقہ بلکہ فقر و فاقہ کے اسباب کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے اور وہ دوبارہ زکوٰۃ کا محتاج نہ ہو۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ "المجموع" میں فرماتے ہیں:

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ فقیر و مسکین کو دیئے جانے والے مالِ زکوٰۃ کی مقدار کیا ہو؟ ہمارے عراقی اور بہ کثرت خراسانی اصحاب کہتے ہیں کہ "ان دونوں کو اتنا مال دیا جائے جو انہیں ضرورت و احتیاج سے نکال کر استغناء اور عدمِ احتیاج سے ہم کنار کر دے۔ مطلب یہ ہے کہ انہیں اتنا مال دیا جائے جو ہمیشہ کے لیے اُن کی ضرورتیں پُوری کرنے کے لیے کافی ہو۔" یہ امام شافعیؒ کے الفاظ ہیں اور امام موصوف کے اس قول کے حق میں مذکورہ بالا اصحاب قبیصہ بن مخارق ہلالی رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث پیش کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "سوال کرنا (ضرورت پڑنے پر مال وغیرہ مانگنا) صرف تین آدمیوں کے لیے جائز ہے۔ ایک وہ جس پر کوئی دیت یا قرض پڑ گیا ہو اس کے لیے مانگنا جائز ہے یہاں تک کہ وہ اتنا مال حاصل کر لے کہ اس کی ضروریاتِ زندگی پُوری ہو جائیں یا فرمایا کہ قوتِ لایموت حاصل ہو جائے۔ دوسرا وہ جس کو کسی آفتِ ناگہانی نے آگھیرا ہو اور اس کا مال اس آفت کی نذر ہو گیا ہو تو اس کے لیے سوال کرنا جائز ہے یہاں تک کہ وہ اتنا مال حاصل کر لے کہ اس کی ضروریاتِ زندگی پُوری ہو جائیں یا فرمایا کہ وہ قوتِ لایموت حاصل کر لے۔

تیسرا وہ جس پر فاقہ کشی کی نوبت آگئی ہو اور اس کی قوم میں سے تین دانا آدمی یہ شہادت دیں کہ واقعی اس پر فاقہ کشی کی نوبت آگئی ہے تو اس کے لیے سوال کرنا جائز ہے یہاں تک کہ وہ اتنا مال حاصل کرے کہ اس کی ضروریاتِ زندگی پوری ہو جائیں یا فرمایا کہ وہ قوتِ لایموت حاصل کرے۔ اُن کے سوا کسی قسم کا سوال کرنا اے قبیصہ! حرام ہے۔ جو کوئی اِس طرح مانگ کر کھاتا ہے وہ حرام کھاتا ہے۔ (صحیح مسلم)

ہمارے اصحاب کہتے ہیں کہ حضرت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ضرورت پوری کرنے کی حد تک سوال کرنے کی اجازت دی ہے، یہ ہماری بات کی ایک دلیل ہے۔ وہ کہتے ہیں اگر سائل عام طور پر کوئی دستکاری کرتا ہو تو اُسے اتنا مال دیا جائے کہ وہ اس سے اپنی دستکاری چلا سکے یا آلاتِ دستکاری خرید سکے خواہ اُن کی قیمت بہت کم ہو یا بہت زیادہ۔ آلاتِ دستکاری کے لیے دی جانے والی رقم اتنی ہو کہ اس کے نفع سے سائل کی ضروریاتِ زندگی قریب قریب پوری ہو جائیں۔ یہ رقم دست کاریوں کی نوعیت، زمان و مکان اور افراد و اشخاص کے مختلف ہونے کے لحاظ سے گھٹ بڑھ سکتی ہے۔ تاہم ہمارے کچھ اصحاب نے متعین طور پر کہہ دیا ہے کہ ایسا سائل جو سبزی ترکاری بیچتا ہو اُسے پانچ یا دس درہم دیئے جائیں۔ اور جو جوہری ہو اُسے دس ہزار درہم دیئے جائیں، کیونکہ اس سے کم رقم لگانے سے اُسے حسبِ ضرورت نفع حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور جو تاجر، نانبائی، عطار یا صراف ہو تو اُسے اپنے پیشے کی نسبت سے دیا جائے۔ اور جو درزی، بڑھئی، دھوبی یا قصاب یا ان کے علاوہ کوئی اور اہلِ صنعت ہو اُسے اتنا مال دیا جائے جس سے وہ اپنے کام کے آلات و اوزار خرید سکے۔ اور اگر وہ کاشتکار ہو تو اُسے زکوٰۃ کی مد سے اتنی رقم دی جائے جس سے وہ کوئی قطعہ اراضی خرید کر اس میں کھیتی باڑی کر سکے اور اس کی پیداوار سے ہمیشہ اُس کا گزارہ چلتا رہے۔ لیکن اگر سائل کوئی دستکار نہ ہو اور کوئی کام بھی اچھی طرح نہ کر سکتا ہو، نہ اُسے تجارت کی شدبد ہو اور نہ کسی کسب سے کوئی واقفیت رکھتا ہو تو اُسے سال بھر کے لیے کچھ دینے کے بجائے اتنی عمر کے لیے کافی مال دے دیا جائے جتنی عمر کہ عام طور پر سائل کے علاقے میں اُس جیسے لوگ پاتے ہیں۔ مثلاً اُسے اتنی رقم دے دی جائے جس سے وہ کوئی جائیداد (مکان یا دکان یا زمین وغیرہ) خرید کر کرائے پہ دے دے اور اس کرائے سے اپنی ضروریاتِ زندگی پوری کرتا رہے۔

یہ تو تھا امام شافعی اور اُن کے اصحاب کا مذہب۔ امام احمد بن حنبلؒ سے بھی روایت کی گئی ہے کہ انہوں نے اجازت دی ہے کہ نقیر تجارتی سامان یا صنعتی اوزار وغیرہ کی شکل میں ہمیشہ اپنے گزارے کے لیے کچھ لے سکتا ہے۔ حنبلی مذہب کے چند علماء نے اس روایت کو اختیار کیا ہے[۱]۔

یہ باتیں ہم اپنی طرف سے نہیں کہہ رہے بلکہ ائمۂ مجتہدین اور فقہائے دینِ متین اسلام کے احکام و قواعد کی نصوصِ صریحہ سے استناد کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں۔ اور یہ باتیں فقر وفاقہ کو ختم کرنے اور زکوٰۃ دے کر فقیر کو امیر کرنے میں اسلام کے مقاصد کی وضاحت وصراحت میں مہرِ نیمروز سے بھی زیادہ روشن ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی پالیسی فقراء و مساکین کے بارے میں اس پُر از حکمت اصول پر مبنی تھی کہ اِذَا اعطیتم فاغنوا "جب تم فقیر و مسکین کو کچھ دو تو اُسے بے نیاز کر دو"[۲] چنانچہ جب آپ کے پاس کوئی مستحق فقیر یا مسکین آتا تو آپ اُسے زکوٰۃ دے کر مالدار کر دیتے تھے نہ کہ محض سدِ رمق کے لیے چند لقمے یا ذرا سنبھالا دینے کے لیے چند درہم عطا کرنے پر اکتفا کرتے تھے۔

ایک دفعہ ایک شخص اپنی بدحالی کی شکایت لے کر آپؓ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے اُسے فقر و افلاس سے بچانے کے لیے تین اونٹ عطا کیے۔ اس وقت اُونٹ سب سے زیادہ نفع بخش اور نفیس ترین مال سمجھا جاتا تھا۔ آپؓ نے صدقات وغیرہ کی تقسیم کرنے والے افسروں سے فرما رکھا تھا کہ "مستحق فقراء و مساکین کو بار بار صدقہ دو اگرچہ اُن میں سے کسی ایک کے پاس سو اُونٹ ہو جائیں"۔ اور فقراء کے بارے میں اپنی پالیسی کا اعلان کرتے ہوئے آپ نے فرمایا تھا "میں مستحق فقراء و مساکین کو بار بار صدقہ دوں گا اگرچہ اس طرح اُن میں سے کسی کے پاس سو اُونٹ چلے جائیں[۳]"

مشہور فقیہ اور جلیل القدر تابعی عطاء فرماتے ہیں "اگر کوئی شخص مسلمانوں کے کسی ایک ہی مستحق کنبہ کے اہلِ خانہ کو اپنے مال کی زکوٰۃ دے کر اُن کے آرام و آسائش کا سامان کر دے تو اس کا یہ عمل میرے نزدیک

---

[۱] الانصاف، ج: ۳، ص ۲۳۸۔

[۲] الاموال لابی عبید ۵۶۵۔

[۳] الاموال ص: ۵۶۵۔

سب سے زیادہ پسندیدہ ہوگا۔[1]

حضرت امام ابوعبید القاسم بن سلام جو کہ اسلام کی مالی فقہ میں حجت سمجھے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب الاموال میں حضرت عطاء رضی اللہ عنہ کے مذکورہ بالا قول کو قابلِ ترجیح فرمایا ہے۔

دوسرا مذہب | مالکیہ، حنابلہ اور بعض دوسرے فقہاء اس بات کے قائل ہیں کہ فقیر اور مسکین کو زکوٰۃ میں سے اتنی رقم دی جائے جس سے ان کا اور ان کے اہل وعیال کا ایک سال تک گذارہ ہوسکے۔ ان اصحاب کی رائے یہ ہے کہ اتنی رقم دینے کی کوئی ضرورت نہیں جو عمر بھر کے لیے کافی ہو۔ اسی طرح وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ سال بھر کے گزارے سے کم رقم نہیں دینی چاہیے۔ ان لوگوں نے گزارے کی حد ایک سال مقرر کر دی ہے۔ کیونکہ عام طور پر اوسطاً جتنی مدت کے گزارے کے لیے رقم یا غلہ وغیرہ جمع کیا جاتا ہے وہ ایک سال ہی ہے۔ چنانچہ صحیحین کی ایک روایت میں ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اہل وعیال کے لیے ایک سال کی خوراک ذخیرہ کی۔ زکوٰۃ چونکہ سال بہ سال ادا کی جاتی ہے اس لیے عمر بھر کے گزارے کے لیے رقم دینے میں کوئی تک نہیں۔ ہر سال زکوٰۃ کے وسائل سے نئی آمدنی ہو جاتی ہے۔ جو شخص پہلے سال زکوٰۃ کا مستحق تھا اور اگر پھر مستحق رہے تو پھر ایک سال کے لیے اسے زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔ اس مذہب کے قائلین کی رائے میں سال بھر کے گزارے کی رقم کی کوئی مقررہ حد نہیں کہ وہ اتنے درہم یا اتنے دینار ہوں بلکہ مستحقِ زکوٰۃ کو سال بھر کا خرچہ دیا جائیگا خواہ وہ کتنی بھی رقم ہو جائے۔ اگر کسی فقیر یا مسکین کا سال بھر کا گزارہ صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہو کہ اُسے نقدی، زمین وغیرہ یا ڈھور ڈنگر کی صورت میں نصاب سے بھی زیادہ دے دیا جائے تو اُسے زکوٰۃ میں سے اتنا دے دینا چاہیے خواہ وہ اس طرح مالدار بن جائے۔ اس لیے کہ زکوٰۃ وصول کرتے وقت تو وہ مستحقِ زکوٰۃ فقیر تھا۔[2]

چند اور مصارفِ زکوٰۃ | ہمارے نزدیک یہ بات یقیناً قابلِ تعریف ہوگی اگر علمائے اسلام اپنی توجہ اس طرف مبذول کریں کہ خورد ونوش اور لباس وغیرہ ہی انسانی ضروریات نہیں ہیں بلکہ انسان کے اندر اور بھی بہت سے جذبات ہیں جو اس سے باصرار اس بات کا مطالبہ کر رہے ہوتے ہیں کہ اُن کی تسکین کی جائے۔ ان میں سے

---

[1] الاموال ص ۵۶۶۔ [2] شرح الخرشی علی متن خلیل ج ۲ ص: ۲۱۵۔

ایک جذبہ جنس (جبلتِ جنسی) ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ایک کوڑا بنایا ہے جس کی چوٹ انسان کو مجبور کرتی ہے کہ وہ زمین کی آبادی اور نسلِ انسانی کے بقا کے سلسلے میں منشائے الٰہی کو پورا کرے۔ اسلام اس جبلت کو بالکل دبا دینے کے حق میں نہیں ہے بلکہ وہ شرعی حدود کے اندر اس کی تسکین کے لیے نکاح کا حکم دیتا ہے۔ اس نے تجرد کی زندگی اور خصّی ہو جانے اور جبلتِ جنسی کو دبانے کی ہر صورت سے منع کیا ہے اور جو شخص ازدواجی زندگی کی ذمہ داریوں کو پورا کر سکتا ہو اُسے نکاح کی تاکید کی ہے جیسا کہ حدیث میں ہے من استطاع منکم الباءۃ فلیتزوج فانہ اغض للبصر و احصن للفرج (تم میں سے جو نکاح کی قدرت رکھتا ہو اسے نکاح کرنا چاہیے کیونکہ یہ نظر اور شہوت کی حفاظت رکھتی ہے۔ پس یہ بات باعثِ تعجب نہیں ہونی چاہیے کہ اسلام میں اُن لوگوں کی مدد کرنا ضروری ہے جو شادی کرنے کے خواہشمند ہوں مگر اس کے اخراجات پورے ادا کرنے سے عاجز ہوں۔ اور یہ بھی کوئی تعجب بات نہیں ہونی چاہیے کہ علماء اس مصرف میں زکوٰۃ کا مال خرچ کرنے پر اتفاق کریں، کیونکہ اس کے لیے نظائر موجود ہیں۔ ابو عبید نے کتاب الاموال میں روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے عاصی کی شادی کردی اور اُس کو ایک ماہ تک بیت المال سے خرچ دیتے رہے۔ خلیفہ راشد عمر بن عبد العزیز نے ایک شخص کو حکم دے رکھا تھا جو اُن کی طرف سے ہر روز یہ منادی کرتا تھا کہ کہاں ہیں مساکین؟ کہاں ہیں قرضدار؟ کہاں ہیں نکاح کرنے والے (جو نکاح کرنا چاہتے ہیں)؟ اور کہاں ہیں یتامیٰ؟ کہ میں اُن میں سے ہر ایک کو غنی کر دوں۔

اس سلسلے میں بنیادی بات تو وہ ہے جسے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص نے آکر کہا "میں نے ایک انصاری عورت سے نکاح کر لیا ہے"۔ آپؐ نے دریافت فرمایا "کتنے مہر پر تو نے اُس سے نکاح کیا ہے"؟ اُس نے کہا "چار اوقیہ پر"۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "چار اوقیہ پر؟ تم تو سمجھتے ہو کہ اس پہاڑ کے پہلو سے چاندی کاٹ لاؤ گے۔ ہمارے پاس کچھ نہیں ہے جو تمہیں دے سکیں، مگر ہاں، یہ ہو سکتا ہے کہ ہم تمہیں کسی مہم پر بھیجیں اور تمہیں اس سے کچھ ہاتھ آجائے"[1] یہ حدیث اس بات

---

[1] نیل الاوطار ج ۶ صفحہ ۱۴۶ پر لکھا ہے کہ اوقیہ اُس وقت چالیس درہم کے برابر ہوتا تھا اور پھر پانچ یا دس درہم کی ہونی تھی لہٰذا یہ مقدار اس آدمی کے لیے زیادہ تھی جو شادی کے اخراجات کے سلسلے میں مدد مانگنے کے لیے آیا تھا۔

پر دلالت کرتی ہے کہ شادی کے لیے لوگوں کو کچھ دینا اُس زمانے میں معروف و مشہور تھا، اسی لیے تو آپؐ نے اس شخص سے یہ نہیں فرمایا کہ اس مقصد کے لیے تم کسی مدد کے مستحق نہیں ہو بلکہ یہ فرمایا کہ ہمارے پاس کچھ نہیں ہے جو تمہیں دے سکیں اور اس کے ساتھ ہی اُسے دوسرا ذریعہ مہیا کرنے کی کوشش کی۔

اسی طرح طلبہ اور اہلِ علم کے لیے علمی کتابیں بھی ضروریاتِ زندگی میں سے ہیں، بلکہ عام آدمی بھی اگر علم حاصل کرنا چاہتا ہو تو اسے زکوٰۃ کی مد سے کتابیں مہیا کی جانی چاہییں۔ اسلام ایک ایسا دین ہے جو عقل و دانش کو مکرم و معظم سمجھتا ہے، علم حاصل کرنے کی دعوت دیتا ہے، علماء کے مقام کو رفعت عطا کرتا ہے، علم کو ایمان کی کلید اور عمل کا رہنما کہتا ہے، اور علم کے بغیر ایمان اور عبادت کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ قرآن میں واضح طور پر ارشاد ہے کہ هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ؟ (کیا علم رکھنے والے اور علم سے بے بہرہ لوگ برابر ہیں؟) جاہل اور عالم اور جہالت اور علم کے درمیان خطِ امتیاز کھینچتے ہوئے قرآن مجید کہتا ہے کہ وَمَا يَسْتَوِى الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ وَلَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّوْرُ (بینا اور نابینا برابر نہیں ہو سکتے اور نہ تاریکیاں اور نور برابر ہو سکتے ہیں)۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ یہاں علم سے مُراد صرف علم دین ہی نہیں بلکہ ہر وہ علم نافع بھی ہے جس کی مسلمانوں کو اپنے دنیاوی معاملات میں ضرورت پیش آتی ہو۔ کیونکہ امام غزالی اور شاطبی وغیرہ نے ایسے نفع بخش علم کو سیکھنا فرض کفایہ قرار دیا ہے۔

لہٰذا یہ امر کوئی باعثِ تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ فقہائے اسلام نے احکام زکوٰۃ کے سلسلے میں یہ بھی فرماتے ہیں کہ جس شخص نے محض حصولِ علم کی خاطر اپنے آپ کو دوسرے سب کاموں سے فارغ کر لیا ہو اُسے زکوٰۃ میں سے کتابوں اور دیگر ضروریاتِ زندگی کے لیے خرچ دے سکتے ہیں، مگر جو شخص محض عبادت کے لیے فارغ ہو بیٹھا ہو اُسے زکوٰۃ نہیں دے سکتے، اس لیے کہ اسلام میں عبادت کیلیے اتنی فراغت کی ضرورت نہیں جتنی کہ علم اور اس میں مہارتِ تامہ حاصل کرنے کے لیے ہے۔ نیز عبادت کا فائدہ صرف عبادت گزار کو ہوگا۔ اور طالب علم کے علم کا فائدہ خود اُسے بھی ہوگا اور دوسرے تمام لوگوں کو بھی[1]۔

اسلام صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ فقہاء نے کہا ہے کہ حاجت مند کے لیے جائز ہے کہ وہ زکوٰۃ کے مال سے وہ علمی کتابیں بھی خرید لے، دین و دنیا کی بہتری کے لیے جن کی اُسے ضرورت ہو[2]۔ (باقی)

---

[1] المجموع ج ۶ ص ۱۹۰ [2] الانصاف فی الفقہ الحنبلی ج ۳ ص ۱۶۵، ۲۱۸۔

رسائل و مسائل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریعی اختیارات

سوال نمبر۱۔ جناب کی تصنیف "سُنّت کی آئینی حیثیت" میری نظر سے گزری۔ اس کے مطالعہ سے میرے تقریباً سب شکوک رفع ہو گئے سوائے چند کے جنہیں دُور کرنے کے لیے آپ سے رجوع کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ میری رہنمائی فرمائیں گے۔

صفحہ ۹۰ پر آپ نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صراحتاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تشریعی اختیارات دیئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے امر و نہی اور تحلیل و تحریم صرف وہی نہیں ہے جو قرآن میں بیان ہوئی ہے بلکہ جو کچھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام یا حلال قرار دیا ہے اور جس چیز کا حضورؐ نے حکم دیا ہے، یا جس چیز سے منع فرمایا ہے، وہ بھی اللہ کے دیئے ہوئے اختیارات سے ہے اور اس لیے وہ بھی قانونِ خداوندی کا ایک حصّہ ہے۔ مگر آپ نے تشریعی کام کی جو مثالیں دی ہیں (ص ۸۸ تا ۹۰)، وہ دراصل تشریحی کام کی ہیں تشریعی کی نہیں۔ موخر الذکر کی جو مثالیں مجھے سوجھی ہیں وہ ذیل میں مذکور ہیں اور ان کے بارے میں جناب سے ہدایت کا طالب ہوں۔

(ا) صفحہ ۸۹ پر کھانے کی بعض چیزوں کی حرمت کے بارے میں آپ نے سورۂ مائدہ پر ہی اکتفا کیا ہے لیکن سُورۂ انعام کی آیت نمبر ۱۴۵ کی رُو سے صرف مُردار، بہتا خون، لحم خنزیر، اور غیر اللہ کے نام پر ذبیحہ حرام ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وحی کے ذریعہ مذکورہ اشیاء کے علاوہ کھانے کی کوئی اور چیز حرام نہیں کی گئی۔ پھر حضورؐ کو دیگر اشیاء کو حرام قرار دینے کی ہدایت کیسے ملی؟

(ب) شریعت بعض صورتوں میں زنا کی سزا رجم قرار دیتی ہے۔ لیکن قرآن مجید میں اس جرم

کے بارے میں اس سزا کا ذکر نہیں ملتا۔ پھر یہ سزا کیسے تجویز ہوئی؟

ان دونوں مثالوں میں احکامِ قرآن اور احکامِ شریعت میں بظاہر کچھ تضاد نظر آتا ہے، لیکن حقیقت میں ایسا نہ ہوگا۔ اُمید ہے حقیقت کی وضاحت فرما کر آپ مجھے ممنون فرمائیں گے۔

جواب: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریعی اختیارات سے میرا مُدعا یہ نہیں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بطور خود اپنی مرضی سے کسی چیز کو حرام یا حلال کر دینے کے اختیارات اللہ تعالیٰ نے دے دیئے تھے بلکہ مدعا یہ ہے کہ ہر حکم کا قرآن ہی میں آنا ضروری نہ تھا بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے جو حکم ادا ہوتا تھا وہ بھی اللہ تعالیٰ کے اشارے سے ہی ہوتا تھا اس لیے مسلمان اس کے مکلّف تھے کہ آپ سے امر و نہی کا جو حکم بھی سُنیں اس کی تعمیل کریں۔ مسلمانوں کا یہ کام نہ تھا کہ آپ کا کوئی حکم سُن کر آپ سے پوچھیں کہ قرآن کی کس آیت سے آپ نے یہ حکم نکالا ہے، یا یہ کہیں کہ آپ جو حکم دے رہے ہیں چونکہ وہ قرآن میں نازل نہیں ہُوا ہے اس لیے ہم اس کی پیروی کے مکلّف نہیں ہیں۔ آخر حضورؐ نے نماز کا جو طریقہ عملاً مسلمانوں کو نماز پڑھ کر اور پڑھا کر بتایا اور زبانی احکام سے اس کی جو تفصیلات لوگوں کو بتائیں وہ قرآن میں کہاں لکھی تھیں؟ لیکن لوگ اس کی پیروی کے مکلّف تھے، کیونکہ انہیں صرف قرآن ہی کی نہیں، رسول کی اطاعت و پیروی کا حکم بھی دیا گیا تھا۔

تشریعی اور تشریحی کام میں جو فرق آپ تجویز کر رہے ہیں اس پر آپ خود غور کریں تو آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ درحقیقت ان میں کوئی فرق نہیں ہے جب اللہ تعالیٰ کے کسی مجمل حکم کی تشریح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کسی قول اور عمل سے کرتے تھے تو وہ بھی اصل حکم کی طرح قانون ہی کی حیثیت رکھتی تھی حالانکہ وہ قرآن میں مذکور نہ ہوتی تھی۔

سورۂ انعام کی آیت ۱۴۵ کے سیاق و سباق پر آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ جاہلیت میں اہلِ عرب نے جن چیزوں کو حرام کر رکھا تھا، وہ حرام نہیں ہیں، بلکہ حرام یہ چیزیں ہیں جو اس آیت میں بیان کی گئی ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان چار چیزوں کے سوا کسی کھانے والے کے لیے کوئی چیز بھی حرام نہیں ہے۔ اِس مطلب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُن ارشادات نے بالکل واضح کر دیا جن میں بتایا گیا ہے کہ درندے اور شکاری پرندے حرام ہیں۔ پس حضورؐ نے قرآن مجید کی بیان کردہ حرام

چیزوں کے علاوہ جن دوسری چیزوں کے کھانے کو حرام قرار دیا ہے یہ حکم قرآن کے حکم سے زائد ہے جو حضورؐ نے وحی خفی کی بنا پر دیا ہے۔

زنا کی سزا کے متعلق میں نے مفصل بحث اپنی تفسیر سورۂ نور میں کی ہے۔ اسے آپ ملاحظہ فرمالیں۔ اس میں یہ بات بھی میں نے واضح کر دی ہے کہ سورۂ نور میں زانی اور زانیہ کے لیے جو سزا مقرر کی گئی ہے وہ دراصل غیر شادی شدہ مجرم کی سزا ہے۔ اس کے دلائل خود قرآن ہی میں دوسرے مقامات پر موجود ہیں جن کی نشاندہی مَیں نے سورۂ نور کی تفسیر میں بھی کی ہے اور سورۂ نساء آیت ۲۵ کی تفسیر میں بھی۔ اس کے لیے آپ تفہیم القرآن جلد اول صفحہ ۳۴۲-۳۴۳ بھی ملاحظہ فرمالیں تو بات پوری طرح واضح ہو جائے گی۔ اِس ساری بحث کو بغور پڑھنے سے آپ پر واضح ہو جائے گا کہ شادی شدہ اشخاص کو زنا پر رجم کی سزا دینا قرآن کے کسی حکم کے خلاف نہیں ہے بلکہ یہ ایک زائد حکم ہے جو حضورؐ کو وحی خفی کے ذریعہ سے ملا تھا اور قرآن میں وارد نہیں ہوا۔

سوال نمبر ۲۔ میرے پہلے خط کے جواب میں جناب فرماتے ہیں کہ سورۂ انعام کی آیت کا مطلب دراصل یہ ہے کہ جاہلیت میں اہلِ عرب نے جن چیزوں کو حرام کر رکھا تھا "حرام وہ نہیں ہیں" بلکہ حرام یہ چیزیں ہیں جو اِس آیت میں بیان کی گئی ہیں۔ لیکن قرآن مجید صرف اتنا ہی نہیں فرماتا بلکہ اِس کی بھی تصریح کرتا ہے کہ جہاں تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی وحی کا تعلق ہے اِن چیزوں کے سوا اور کوئی چیز اس میں حرام نہیں کی گئی۔ قرآن کریم کے الفاظ بالکل صاف ہیں اور ان میں کوئی گنجلک نہیں۔ پھر آپ کیوں فرماتے ہیں کہ "اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان چاروں چیزوں کے سوا کسی کھانے والے کے لیے کوئی چیز بھی حرام نہیں ہے"؟ مہربانی فرما کر اس کی وضاحت فرما دیں۔

تفہیم القرآن پہلے بھی پڑھ چکا تھا اور اب آپ کے فرمانے پر سورۂ نساء اور سورۂ نور میں جناب کے نوٹوں کا دوبارہ مطالعہ کیا۔ لیکن اگر آپ اسے سوءِ ادب نہ سمجھیں تو عرض کروں کہ دلیل دل کو نہیں لگی۔ عام طور پر موازنہ متماثل اشیاء میں ہوتا ہے۔ یعنی ایک شادی شدہ لونڈی

کو اگر محصنہ کی سزا کا کوئی حصہ ملتا ہے تو محصنہ بھی شادی شدہ ہونی چاہیے ورنہ قرآن مجید کو اس کی وضاحت کرنی چاہیے تھی کہ یہاں شادی شدہ لونڈی کا شادی شدہ محصنہ سے مقابلہ نہیں کیا جا رہا بلکہ غیر شادی شدہ سے کیا جا رہا ہے۔ کیا آپ فرما سکتے ہیں کہ قرآن مجید یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی صراحت فرمائی ہے؟ سورۂ نور میں آپ کے نوٹ میں صفحہ ۲۲۹ پر لکھا ہے کہ حضرت علیؓ نے ایک عورت کو جمعرات کو کوڑے لگوائے اور جمعہ کے روز اسے رجم کیا اور فرمایا کہ ہم نے کتاب اللہ کے مطابق کوڑے لگاتے ہیں اور سنّتِ رسول اللہ کے مطابق سنگسار کرتے ہیں۔ یعنی حضرت علیؓ کے نزدیک سورۂ نور والی سزا غیر شادی شدہ محصنات تک محدود نہ تھی۔ شاید اسی وجہ سے امام احمد، داؤد ظاہری اور اسحاق بن راہویہ نے بھی پہلے سو دُرّے لگانے اور بعد میں سنگسار کرنے کی سزا تجویز کی ہے (ایضاً صفحہ ۲۳۰) اگر یہ استنباط درست ہے تو اس بات کے حق میں کافی وقیع شہادت موجود ہے کہ زنا کی سو دُرّے کی سزا کا اطلاق شادی شدہ محصنات پر بھی ہوتا ہے۔ پھر ان کو رجم کی سزا کیوں دی جاتی ہے؟

جواب ۔ سورۂ انعام کے علاوہ چار چیزوں کی حرمت کا ذکر سورۂ مائدہ، سورۂ نحل اور سورۂ بقرہ میں بھی آیا ہے۔ مگر ان تینوں مقامات پر ایسا کوئی لفظ نہیں ہے جس سے یہ خیال کیا جا سکتا ہو کہ ان چیزوں کے سوا اور کوئی چیز حرام نہیں ہے۔ یہ بات صرف سورۂ انعام میں کہی گئی ہے کہ وحی کے ذریعہ سے جن چیزوں کی حرمت کا حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا ہے اُن میں اِن چار چیزوں کے سوا اور کسی چیز کا ذکر نہیں ہے۔ اِسی لیے مَیں نے عرض کیا تھا کہ اِس آیت کو اس کے سیاق و سباق میں رکھ کر غور کیجیے۔ سیاق و سباق بتا رہا ہے کہ یہاں دراصل اُن چیزوں کے حرام ہونے کی نفی مقصود ہے جنہیں اہلِ عرب نے زمانۂ جاہلیت میں حرام کر رکھا تھا اور یہ بتانا مقصود ہے کہ حرام وہ چیزیں نہیں بلکہ یہ ہیں۔

سورۂ نساء کی جس آیت کی طرف مَیں نے آپ کو توجہ دلائی تھی اس کے الفاظ پر آپ دوبارہ غور فرمائیں۔ اس میں یہ فرمایا گیا ہے کہ جو شخص اتنی استطاعت نہ رکھتا ہو کہ "مومن محصنات" سے نکاح کر سکے تو وہ تمہاری مومن لونڈیوں میں سے کسی کے ساتھ نکاح کرلے۔ اس کے بعد اسی آیت میں فرمایا گیا کہ یہ لونڈیاں جب

کسی کے نکاح میں آکر مُحصَنہ بن جائیں اور پھر بدکاری کی مرتکب ہوں تو اُن کو اُس سزا کی نصف سزا دی جائے جو مُحصَنات کے لیے ہے۔ اس آیت میں دو جگہ لفظ مُحصَنات استعمال ہُوا ہے اور ظاہر ہے کہ دونوں جگہ یہ لفظ ایک ہی معنی میں لیا جاسکتا ہے۔ اب کیا آپ کا یہ خیال ہے کہ آیت کے پہلے فقرے میں مُحصَنات سے مراد شادی شدہ عورتیں ہیں؟ یعنی کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص شادی شدہ مومن عورتوں سے نکاح کرنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو وہ مومن لونڈی سے نکاح کرے؟ اگر اس کا یہ مطلب نہیں لیا جاسکتا تو ظاہر ہے کہ اس فقرے میں مُحصَنات سے مُراد آزاد خاندان کی غیر شادی شدہ عورتیں ہی ہوسکتی ہیں۔ اور جب ایسی عورتوں کے مقابلہ میں مومن لونڈیوں کا ذکر کیا گیا ہے تو اس کا مطلب یہی ہوسکتا ہے کہ جس معنی میں آزاد خاندان کی غیر شادی شدہ لڑکی مُحصَنہ ہوتی ہے اس معنی میں غیر شادی شدہ لونڈی مُحصَنہ نہیں ہوتی۔ پھر جب یہ فرمایا گیا کہ شادی شدہ ہوجانے کے بعد جب ایک لونڈی مُحصَنہ بن جائے اور پھر بدکاری کی مرتکب ہو تو اس کی سزا اُس سزا کی نصف ہے جو مُحصَنات کے لیے مقرر ہے، تو اس دوسرے فقرے میں مُحصَنات کی سزا سے مراد وہی سزا ہوسکتی ہے جو غیر شادی شدہ آزاد خاندانی لڑکی کے مرتکبِ زنا ہونے کے لیے ہے۔ یہاں آپ اِس لفظ کو شادی شدہ آزاد عورت کے معنی میں نہیں لے سکتے، کیونکہ ایک ہی آیت میں ایک ہی لفظ کو دو مختلف معنوں میں لینا کسی طرح درست نہیں ہوسکتا۔ باقی رہا حضرت علیؓ کے قول اور فعل سے آپ کا استدلال، تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس معاملہ میں حضرت علیؓ نے جو رائے قائم فرمائی تھی اس میں وہ صحابہ کرام کے درمیان منفرد تھے۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زانی مُحصَن کو کبھی رجم کرانے سے پہلے کوڑے نہیں لگوائے۔ اسی طرح باقی تین خلفائے راشدین کے زمانے میں بھی کبھی ایسا نہیں ہُوا کہ رجم سے پہلے زانی مُحصَن کو کوڑے لگوائے گئے ہوں۔ دوسرے کسی صحابی کا قول بھی اس کی تائید میں مجھے نہیں ملا۔ اور جمہور فقہائے بھی حضرت علیؓ کے اس اجتہاد کو قبول نہیں کیا۔

(بقیہ اشارات)

اور آج وہاں خانقاہیں قحبہ گاہیں بنی ہوئی ہیں۔ افسوس کہ ان حضرات نے قریب ترین تاریخ کے ان تجربات سے کوئی سبق نہ لیا اور عین اُس وقت جبکہ طوفان سر پر تھا، انہوں نے بھی یہ ضروری سمجھا کہ چند خاص مذہبی تعصبات بھڑکا کر اور اپنی مشیخت کے اثرات استعمال کر کے مسلمانوں کے ووٹ بانٹیں اور چند نشستیں حاصل کر لیں۔

مرکزی جمعیت علمائے اسلام بھی، جو مغربی پاکستان میں تھانوی گروپ اور مشرقی پاکستان میں نظامِ اسلام کے نام سے معروف ہے اس معاملہ میں پیچھے نہیں رہی۔ اس نے سرحد میں دو، پنجاب میں چار، سندھ میں ایک اور مشرقی پاکستان میں ۴۵ آدمی کھڑے کر دیئے۔ یہ جماعت مغربی پاکستان میں کئی سال کے خوابِ گراں سے اٹھ کر ۱۹۶۹ء میں بیدار ہوئی تھی، البتہ مشرقی پاکستان میں یہ ۱۹۴۸ء سے کسی نہ کسی طرح موجود رہی تھی۔ اِس جماعت کے بزرگ خود ہی بہتر جانتے ہیں کہ ملک کے دونوں بازوؤں میں علیحدگی پسندی اور اشتراکیت کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے ان کا انتخابی میدان میں آنا اور اپنا حصہ الگ حاصل کرنے کی کوشش کرنا کس حد تک مددگار ثابت ہوا؟ ان کی تنظیم کتنی تھی؟ ان کے پاس کارکن کتنے تھے؟ انہوں نے پچھلے ۲۲ سال میں اُن اسباب کو رفع کرنے کے لیے کیا اور کتنا کام کیا تھا جن کی بدولت باثر جدید تعلیم یافتہ طبقوں میں اساتذہ میں، طلبہ میں، مزدوروں میں اور قومی زندگی کے دوسرے طاقتور عناصر میں نسلی و لسانی اور علاقائی منافرت اور لادینی و اشتراکیت کا یہ طوفان کھڑا ہوا تھا؟ محض وعظ اور تقریریں، اور وہ بھی عین طوفان کے اُٹھ جانے کے بعد، جس حد تک کارگر ہو سکتی تھیں اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں ہے۔

جمعیۃ علمائے اسلام (ہزاروی گروپ) بھی اشتراکی عناصر کو پوری تقویت بہم پہنچانے کے بعد اُدھر سے متروک و مطرود ہو کر اسلام پسندوں کی صفوں میں آکھڑی ہوئی۔ اس نے بلوچستان سے ۴، سرحد سے ۱۹، پنجاب سے ۴۷، اور سندھ سے ۲۰ امیدوار کھڑے کر دیئے اور اپنا سارا زور اسلام کے خادموں ہی کو گالیوں اور جھوٹے الزامات سے نواز کر حامیانِ اسلام کے ووٹ بانٹنے میں صرف کر دیا۔

اب خالص سیاسی جماعتوں کو دیکھیے۔ ان میں عبدالقیوم گروپ اور فضل القادر گروپ دونوں کنونشن لیگ کے وہ حصے تھے جن پر ایوبی دور کے تمام اعمال کی ذمہ داری عائد ہوتی تھی، مگر دونوں اپنے اس ماضی کو لیے ہوئے "اسلام پسندی" کے دعوے کے ساتھ میدان میں آگئے۔ عبدالقیوم گروپ نے بلوچستان میں ۴، سرحد میں ۱۷، پنجاب میں ۴۳، سندھ میں ۱۲، اور مشرقی پاکستان میں ۶۵ امیدوار کھڑے کیے۔ اور فضل القادر گروپ نے سرحد میں ایک، پنجاب میں ۲۴، سندھ میں ۶، اور مشرقی پاکستان میں ۹۳ آدمی کھڑے کر دیئے۔

مسلم لیگ کا تیسرا عنصر، جو کونسل لیگ کے نام سے معروف ہے، اگرچہ ایوبی دور میں حزبِ اقتدار سے الگ رہا لیکن بعد میں اس کے اندر بھی کنونشن لیگ کے بہت سے لوگ اپنے ماضی کے داغ لیے ہوئے آ شامل ہوئے۔ اس کے دامن میں اِس دعوے کے سوا درحقیقت

کوئی کارنامہ نہ تھا کہ ہم ہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے پاکستان بنایا تھا۔ گویا پاکستان بنانا بجائے خود اس کے لیے کافی تھا کہ پاکستان پر ان کا مستقل دائمی حق تسلیم کر لیا جائے، قطع نظر اس سے کہ اس کے بنانے کے بعد انہوں نے اس کو تفرقہ سے محفوظ رکھنے اور حقیقت میں ایک اسلامی ریاست بنانے کے لیے کیا خدمت انجام دی۔ یہ جماعت بھی اپنے پچھلے موروثی حقوق کی بنیاد پر "اسلام پسند" کی حیثیت سے میدان میں آگئی اور اس نے بلوچستان سے دو، سرحد سے پانچ، پنجاب سے پچاس، سندھ سے بارہ اور مشرقی پاکستان سے پچاس امیدوار کھڑے کر دیئے۔

چوتھی سیاسی جماعت پی ڈی پی تھی جس نے "اسلام پسندوں" کی صفوں سے انتخابات میں حصہ لیا اور بلوچستان سے ایک، سرحد سے ۲، پنجاب سے ۱۲، سندھ سے ۳، اور مشرقی پاکستان سے ۱۸ آدمی کھڑے کیے۔ اُس احترام کے باوجود جو ہمارے دل میں اس کے لیڈروں اور ان خدمات کی قدر کرنے کے باوجود جو اس میں شریک ہونے والی جماعتوں نے آمریت کے خلاف انجام دیں، ہم اگر یہ بات کہیں تو غلط نہیں کہیں گے کہ یہ جماعت زیادہ تر لیڈروں پر مشتمل تھی۔ اپنی تنظیم اور کارکنوں کی تعداد اور اپنے کام کے لحاظ سے اس کا یہ مقام نہ تھا کہ اس نازک موقع پر وہ بھی انتخابات میں حصہ لے کر ۸۰ نشستوں کے لیے اپنے آدمی کھڑے کر دیتی۔

مذکورۂ بالا جائزے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جہاں مخالف کیمپ سے ملک کے مختلف حصوں میں عملاً ایک ہی ایک پارٹی میدان میں آئی تھی، وہاں اسلامی نظام اور پاکستان کی وحدت و سالمیت کے حامی کیمپ سے ہر نشست پر کئی کئی جماعتیں مقابلے پر آئیں اور ان کے ساتھ آزاد امیدواروں کی بھی ایک کھیپ کی کھیپ ہر جگہ کھڑی ہو گئی۔ اس لیے اگر جماعت اسلامی انتخابات میں سرے سے شریک نہ بھی ہوتی تو نتیجہ اُس سے مختلف نہ ہو سکتا تھا جو فی الواقع اب برآمد ہوا ہے۔

اس کے بعد دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اِن تمام سیاسی اور مذہبی جماعتوں اور آزاد امیدواروں میں سے آخر کس جماعت اور کس فردِ آزاد نے پچھلے ۲۳ سال میں اسلام کے متعلق جدید تعلیم یافتہ طبقوں کے شکوک و شبہات کو رفع کرنے اور ان کو یہ بتانے کے لیے مسلسل کام کیا تھا کہ اسلامی قانون، اسلامی نظامِ معیشت، اسلامی نظامِ حکومت اور بحیثیت مجموعی پورا اسلامی نظامِ زندگی کیا ہے اور کس طرح وہ اس دور میں نہ صرف قابلِ عمل ہے بلکہ ہر دوسرے نظام سے فائق ہے؟ کس نے مشرقی پاکستان کے نئے تعلیم یافتہ لوگوں میں اسلامی تعلیمات کی اشاعت کر کے اُن کی ایک کثیر تعداد کو لادینی اور بنگلہ قوم پرستی کے زہر سے بچانے کے لیے عملاً کوئی کام کیا تھا؟ کس نے اُستادوں میں، طلبہ میں، مزدوروں میں، اور قومی زندگی کے دوسرے با اثر گروہوں میں نفوذ کر کے ہر جگہ اسلام کی حمایت کرنے والے مضبوط گروپ تیار کر دیئے تھے؟ کس نے بلوچی، سندھی، پٹھان، پنجابی اور بنگالی عصبیتوں کا باہم مقابلہ کر کے ملک کی آبادی کے ہر حصے میں اسلامی قومیت کا حامی ایک فعال گروہ منظم کر دیا تھا؟ کس کے پاس ایسی تنظیم تھی جس کے کارکن پاکستان کے مشرقی اور مغربی بازو میں ہر جگہ موجود ہوں اور اسلامی نظام کے لیے عام رائے تیار کرنے میں ہمہ وقت مصروف رہے ہوں؟

کسی میں آنا دسپلن تھا کہ اگر دوسری جماعتوں کے ساتھ انتخابات کی خاطر کوئی سمجھوتہ کیا جاتا تو اس کے امیدوار کو جہاں بھی بیٹھنے کے لیے کہا جاتا وہ بیٹھ جاتے اور خود اپنی جماعت کے خلاف خم ٹھونک کر کھڑے نہ ہو جاتے؟ اس سلسلے میں اگر جماعت اسلامی کے سوا کسی اور کا نام لیا جا سکتا ہو تو ہمیں اس کا نام سن کر بڑی خوشی ہو گی لیکن اگر انصاف بھی دنیا میں کسی چیز کا نام ہے تو ہم یہ توقع نہیں رکھتے کہ کوئی شخص ان جملہ حیثیات سے جماعت اسلامی کے منفرد مقام کا انکار کر سکے گا۔ پھر جب حقیقت یہ ہے تو کیا یہ مناسب نہ تھا کہ جن لوگوں کو اسلام اور پاکستان کی وحدت کا تحفظ اس کی بہ نسبت عزیز تر تھا کہ قومی اسمبلی کی نشستوں میں اُن کو بھی حصہ ملے، وہ مخالف کیمپ کے رویہ کو دیکھ کر ہی کم از کم یہ سبق لیتے کہ اسلامی کیمپ سے بھی صرف ایک ہی جماعت کو سامنے لاتے اور سب مل کر اس کا ساتھ دیتے؟ اس صورت میں اغلب یہ ہے کہ نتائج اس سے بہت مختلف ہوتے جو اب رونما ہوتے ہیں۔ لیکن عملاً ہوا کیا؟ اکثر و بیشتر لوگوں کو اگر کسی کا وجود سب سے زیادہ ناگوار تھا تو وہ جماعت اسلامی ہی تھی۔ جگہ جگہ سے کوئی مطالبہ تھا تو یہ کہ جماعت اپنے آدمی ہٹالے۔ جہاں بھی اس مطالبہ کو پورا نہ کیا گیا وہاں جماعت اور اس کے امیر پر کیچڑ اچھالی گئی، اس کے خلاف ہر طرح کے تعصبات بھڑکائے گئے، اور ایسے ایسے سفید جھوٹ گھڑ گھڑ کر پھیلائے گئے جن کی توقع کسی ایسے شخص سے نہیں کی جا سکتی جو یقین رکھتا ہو کہ کبھی اس کو مرنا بھی ہے اور خدا کے سامنے جا کر جواب بھی دینا ہے۔

اِن حالات میں اگر جماعت نے شکست کھائی ہے تو اُن لوگوں نے بھی کوئی فتح نہیں پائی جنہوں نے جماعت کے خلاف یہ حربے استعمال کیے، بلکہ انہوں نے پاکستان پر علاقائی قوم پرستوں اور لادینی و اشتراکیت کے حامیوں کو مسلط کرانے کا مظلمہ اپنی گردن پر لیا ہے۔ جہاں تک جماعت کا تعلق ہے، الحمدللہ کہ اس نے اور اس کے ذمہ دار کارکنوں نے کسی کو گالی دے کر، کسی کے خلاف جھوٹے الزامات لگا کر، انتخابات جیتنے کے لیے کوئی ناجائز طریقہ اختیار کر کے، اور حق و انصاف سے تجاوز کر کے اپنی عاقبت خراب نہیں کی۔ اس نے ایمانداری کے ساتھ یہ کوشش کی کہ دنیا اور دین کا علم رکھنے والے، اور قابلِ اعتماد سیرت و کردار رکھنے والے آدمیوں کی ایک ایسی ٹیم انتخابات کے میدان میں لائے جو ہر قسم کے مذہبی اور علاقائی تعصبات سے پاک ہوں، ملک کے ہر حصے اور مسلمانوں کے ہر گروہ سے تعلق رکھتے ہوں، اور جن سے یہ امید کی جا سکے کہ پاکستان اور مسلم ملت کی وحدت کو برقرار رکھتے ہوئے یہاں اسلام کی بنیاد پر ایک عادلانہ نظام قائم کر سکیں گے۔ اس کی یہ کوشش اگر لوگوں کو پسند نہیں آئی تو کوئی مضائقہ نہیں۔ جماعت کا کام صرف انتخابات تک محدود نہیں ہے۔ گذشتہ ایک سال کی جدوجہد میں اسے کئی لاکھ نئے حامی مل گئے ہیں جن کی تنظیم اور تربیت کر کے انشاءاللہ وہ اپنے کام کو پہلے سے بہت زیادہ بڑے پیمانے پر پھیلائے گی، آگے نتائج اس ذاتِ پاک کے ہاتھ میں ہیں جو مالک الملک ہے اور جس نے فیصلے کے اختیارات اپنے ہی ہاتھ میں رکھے ہیں، بندوں کو سونپ نہیں دیئے ہیں۔